الفوائد الدراسية

فی شرح

العقیدۃ الطحاویۃ

کتاب "عقیدہ طحاویہ" کی مختصر اور جامع شرح جس میں متن کے سلیس ترجمہ کے
ساتھ حل عبارات اہم اور مفید مباحث سہل اسلوب میں پیش کیے گئے ہیں

تالیف

ابو سلمان ذر محمد صاحب

مکتبہ عمر فاروق

شاہ فیصل کالونی نمبر ۴ کراچی

الفوائد الدراسیة

فی شرح

العقیدة الطحاویة

کتاب "عقیدۃ الطحاویۃ" کی مختصر اور جامع شرح جس میں متن کے سلیس ترجمہ
کے ساتھ حل عبارت اہم اور مفید مباحث سہل اسلوب میں پیش کیے گئے ہیں

تالیف

ابوسلمان زرمحمد صاحب

4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی
Tel: 021-34594144 Cell: 0334-3432345

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحات
۱	تقریظ: حضرت مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب	۵
۲	انتساب	۶
۳	کچھ کتاب کے بارے میں	۷
۴	پیش لفظ	۹
۵	حالات مصنفؒ	۱۳
۶	توحید	۱۹
۷	عقیدہ کی تعریف	۱۹
۸	التوفیق	۱۹
۹	توحید کی اہمیت	۲۰
۱۰	ارادہ کی تعریف	۲۳
۱۱	رسالت	۲۶
۱۲	نبی اور رسول میں فرق	۲۷
۱۳	قرآن مجید	۳۱
۱۴	صفات باری تعالیٰ	۳۲
۱۵	رؤیت باری تعالیٰ	۴۳
۱۶	معراج	۵۲
۱۷	حوض کوثر	۵۳
۱۸	التجاءات	۵۵

نمبر	عنوان	صفحہ
۱۹	عہدِ میثاق	۵۶
۲۰	لوح و قلم	۶۱
۲۱	عرش و کرسی	۶۵
۲۲	فرشتوں، پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان	۶۸
۲۳	اہلِ قبلہ کی تعریف	۷۹
۲۴	کراماً کاتبین	۸۷
۲۵	ملک الموت	۸۸
۲۶	عذابِ قبر	۸۹
۲۷	بعث کی تعریف	۹۳
۲۸	افعال العباد	۱۰۰
۲۹	خلق اور کسب کا فرق	۱۰۰
۳۰	ایصالِ ثواب	۱۰۳
۳۱	خلافت	۱۰۸
۳۲	عشرہ مبشرہ	۱۱۲
۳۳	معجزہ اور کرامت کا فرق	۱۱۵
۳۴	اقسام خارق عادات	۱۰۹
۳۵	علامات قیامت	۱۱۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

مناظر اسلام حضرت مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب

استاذ الحدیث جامعہ فاروقیہ

حامداً و مصلیاً و بعد . اس میں کوئی شک نہیں کہ اعمال کی قبولیت کا دارومدار عقائد صحیحہ پر ہے، اگر عقائد ہی درست نہ ہوں تو کیا عبادات سے کچھ حاصل نہ ہوگا، اسی لئے سلف صالحین نے عقائد کی اصلاح پر بہت زور دیا۔

عقائد کے باب میں امام طحاوی رحمہ اللہ کی "العقیدۃ الطحاویۃ" کو اپنے اختصار و جامعیت کی بناء پر مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جملہ فرق مسلک اہلسنت والجماعت کے تمام مذاہب فقہ کے ہاں اسے مسلمہ حیثیت حاصل ہے حتی کہ غیر مقلدین جو فروعات میں مقلدین کو گمراہ اور بدعتی کہتے ہیں، عقائد کے باب میں یہی کتاب پڑھاتے ہیں۔

یوں تو اس کی عربی شروحات کافی ہیں لیکن اردو میں کوئی ایسی شرح جو اس کے معانی و مطالب کو واضح کرے موجود نہ تھی۔ مولانا نذر محمد صاحب استاذ جامعہ فاروقیہ کراچی جو ایک تحقیقی ذوق رکھنے والے عالم ہیں انہوں نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی اردو شرح لکھنے کا اہتمام کیا۔

اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث مکمل کتاب تو نہ دیکھ سکا، چند ایک مقامات ملاحظہ کئے جو کافی تسلی بخش و حوصلہ افزا ہیں۔

امید ہے کہ علماء و طلباء کے لئے یہ ایک بہترین کاوش ثابت ہوگی۔

(حضرت مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب)

۱۴۲۹/۷/۳۰

احقر اپنی اس صغیر، مگر مبارک کام کو اپنے والد محترم اور والدہ مرحومہ کی طرف منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے، جن کی حسن تمنا، دعاؤں اور محنتوں سے اس لائق ہوا۔

ربّ ارحمهما كما ربّياني صغيرا .

زر محمد غفرلہ

کچھ کتاب کے بارے میں

العقيدة الطحاوية المسماة ب"بيان السنة والجماعة" تیسری صدی ہجری کے متبحر عالم امام ابوجعفر طحاوی حنفی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔"عقیدۃ الطحاویہ" کے نام سے مشہور اور متداول یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود تمام بنیادی عقائد کے اصول پر حاوی ہے، گویا امام طحاویؒ کا یہ رسالہ "بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا مصداق ہے، یہ کتاب اپنی خصوصیت اور جامعیت کی وجہ سے عقائد کی اہم کتاب شمار کی جاتی ہے، امام طحاوی کی علمی عظمت حقیقت شناسی اور حسن بیان کی وجہ سے کتاب "عقیدۃ الطحاویہ" کو احناف کے علاوہ اہل السنۃ والجماعۃ کے تمام مکاتب فکر میں شہرت ملی، عقیدۃ طحاویہ اس وقت دنیا کی تمام اہم درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے۔

کتاب کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے دو سال قبل ارباب وفاق المدارس العربیہ کی تعلیمی کمیٹی نے "العقیدۃ الطحاویۃ" کو درجہ عالیہ (سادسہ) کے مجوزہ نصاب میں داخل کردیا، چنانچہ اب یہ کتاب الحمد للہ تمام مدارس میں داخل درس ہے، اس رسالہ میں اختصار کے ساتھ تمام ضروری عقائد موجود ہیں، یہ اس قابل ہے کہ طلبہ اس کو زبانی یاد کریں۔

یوں تو اس کتاب کی عربی شروحات کی تعداد تیرہ تک پہنچتی ہے جن میں اکثر شراح حنفی المسلک ہیں لیکن ہمارے نصاب میں چونکہ صرف متن داخل ہے، اس لئے طلبہ کے لئے تفصیلی اور طویل شروحات کی طرف رجوع کرنا قدرے مشکل تھا۔

احقر تین سال سے شرح عقائد کے بعد یہ کتاب پڑھا رہا ہے، اس لئے پڑھاتے وقت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ کتاب کی کوئی ایسی شرح ہو کہ جس میں

کتاب کی مختصر جامع اور طلب مباحث کی تشریح آجائے، چنانچہ الفوائد الدراسية في شرح العقيدة الطحاوية کے نام سے یہ شرح آپ کے ہاتھوں میں ہے، تشریحات لکھتے وقت عقیدۂ طحاویہ کی عربی شرح "شرح العقيدة الطحاوية" مؤلفہ امام قاضی علی بن علی بن محمد بن ابی العز الدمشقی (المتوفی ۷۹۲ھ) اور عربی کی دوسری شرح "شرح العقيدة الطحاوية" مؤلفہ علامہ فقیہ محقق عبدالغنی الغنيمي الميداني الحنفي (المتوفی ۱۲۹۸ھ) کے علاوہ شرح العقائد مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے علم الکلام اور دوسری کتب سے استفادہ کیا ہے، حسب ضرورت لغات اور ترکیب کا اہتمام بھی کیا ہے اور ترجمہ لکھتے ہوئے موجود اردو تراجم سے بھی جگہ جگہ استفادہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ احقر کی اس کاوش کو قبولیت عطا فرمائے اور مزید اس سے بڑے کام کی توفیق عطا فرمائے۔

طلبہ کرام اور قارئین سے التماس ہے کہ احقر کو اپنی دعاؤں میں فراموش نہ کریں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

احقر نذر محمد غفرلہ

خادم تدریس جامعہ فاروقیہ کراچی

۲۳ جمادی الثانی ۱۴۳۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

احکام شرعیہ (یعنی جو احکام ہم کو شریعت سے معلوم ہوئے ہیں) دو قسم کے ہیں۔

(الف) کچھ تو وہ ہیں جو عمل سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی جن میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے عمل کا مطالبہ ہو، بالفاظ دیگر جن میں کچھ کرنا پڑتا ہو، جیسے شریعت کا یہ حکم کہ نماز اور روزہ فرض ہے، معاملات بھی اسی قسم اول ہی میں داخل ہیں۔ ایسے احکام کو احکام عملیہ اور احکام فرعیہ کہتے ہیں اور جس فن میں ان احکام کا بیان اور تفصیل ہے اس فن کا نام علم فقہ ہے۔

(ب) دوسرے کچھ احکام وہ ہیں جو اعتقاد کرنے سے تعلق رکھتے ہیں، بالفاظ دیگر جن میں کچھ کرنا نہیں پڑتا، بلکہ صرف دل سے ماننا پڑتا ہے مثلاً شریعت کا یہ حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، حی ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، علیم ہے۔ قیامت، جنت، دوزخ سب برحق ہیں۔ ظاہر ہے مقصود اس سے کوئی عمل نہیں، بلکہ مان لینا اور اعتقاد کر لینا ہے۔ ایسے احکام کو احکام اعتقادیہ یا احکام اصلیہ کہتے ہیں اور جس فن سے ان احکام کا علم ہوتا ہے اس کو علم التوحید والصفات کہتے ہیں۔ نیز اس فن کو علم اصول الدین، علم العقائد اور علم الکلام بھی کہا جاتا ہے۔ اس وقت ہمارا موضوع بحث احکام شرعیہ کی یہ قسم ثانی ہے۔

دراصل عقائد کی بڑی اہمیت ہے۔ عقیدہ دین اسلام کی اصل اور بنیاد ہے اور عمل اس کی فرع ہے کہ اگر عقیدہ درست نہیں تو جہنم کا دائمی عذاب ہوگا، عمل میں کوتاہی ہو تو نجات کی امید ہے، چاہے ابتداء ہی میں ہو جائے یا سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائے۔

علم عقائد کی تدوین کا پس منظر:

پیغمبر اسلام کی وفات تک تمام مسلمانوں کا عقیدہ ایک ہی تھا، اصول و عقائد میں کوئی اختلاف اس وقت تک نہیں تھا۔ عقائد میں جو اختلاف پیدا ہوا وہ صحابہ رضوان اللہ اجمعین کے

تھے مگر قدرت کو ان سے کتاب وسنت کی حمایت واشاعت کا کام لینا تھا۔ چنانچہ انہوں نے معتزلہ کا مذہب ترک کر دیا۔ امام ماتریدیؒ اور ابو الحسنؒ دونوں حضرات اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد میں امام ہیں۔ صرف چند ایک مسائل میں ان کا آپس میں اختلاف ہے۔ عقائد کے اعتبار سے گو اہل السنۃ والجماعۃ میں بنیادی طور پر کوئی اہم اختلاف نہیں ہے، تاہم عقائد ماتریدیہ اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ ان کی تدوین فلسفہ کے اثر سے قطعاً پاک ہیں۔

(ملخص از بیان الفوائد صدر الشریعہ مقدمہ اہل السنت والجماعت، اسلامی عقائد)

اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے اور اسی لئے وہ انسانی فطرت کے مطابق آسان اور سلیس زبان میں عقائد، احکام اور اخلاق کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اسلام کی اسی فطری سادگی کے سبب علم العقائد کی ابتداء میں انتہائی سادہ اور مختصر تھا یعنی صاف اور سلیس زبان میں عقائد صحیحہ کا بیان تھا، فلسفیانہ مباحث کو ان میں دخل نہ تھا جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ کی کتاب "الفقہ الاکبر" ملا علی قاریؒ کی کتاب "شرح فقہ الاکبر" علامہ نسفیؒ کی کتاب "بحر الکلام" اور علامہ ابو شکور السالمیؒ کی کتاب "کتاب التمہید" اس کی مکمل مثالیں ہیں۔

لیکن جب دوسری صدی میں خلیفہ منصور (المتوفی ۱۵۸ھ) کے عہد میں جب فلسفہ یونان کا عربی میں ترجمہ ہوا تو مسلمانوں کا پہلی بار یونانی فلسفہ سے تعارف ہوا اور ایک نیا طرز استدلال اور طریق بحث و فکر سامنے آیا اور اس کے نتیجہ میں خلق قرآن جبر و قدر، رؤیت باری تعالیٰ وغیرہ نئے نئے مسائل وجود میں آئے۔ دینی فلسفیوں کے اس گروہ میں معتزلہ سرفہرست تھے، جو عقل پرستی میں تجاوز کر گئے تھے، چنانچہ مختلف مسائل میں معتزلہ فلسفیانہ طرز استدلال اختیار کرتے، جس سے لوگ متاثر ہوتے اور معتزلہ کی عقلیت اور تفلسف سے علماء مرعوب ہو رہے تھے، اس لئے علماء اور متکلمین نے فلسفہ ہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کر کے اسلامی عقائد و نظریات کو عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کر دیا لیکن یہ حضرات متکلمین محدثین کے خلاف نہ تھے، بلکہ متکلمین معتزلہ کا رد انہی کے ہتھیاروں سے کرتے تھے۔ بہر حال اس طرح سے متاخرین کے علم کلام میں فلسفہ کی آمیزش ہو گئی،

چنانچہ متاخرین نے علم کلام میں بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں علامہ تفتازانی کی کتاب "شرح مقاصد، شرح عقائد" قاضی عضد الدین کی کتاب "مواقف" قاضی بیضاوی کی کتاب "الطوالع والتهذیب" اور امام رازی کی کتابیں شامل ہیں۔ لیکن "إحياء العلوم" میں امام غزالیؒ نے کیا خوب کہا ہے: کہ علماء متکلمین کی غرض علم کلام سے یہ نہیں کہ اپنے عقائد کی تصحیح اس سے کریں ان کے عقائد کا ماخذ وحی جو ان کا نبوت ہے، علم کلام تو صرف معاندین کے الزام کے لئے تھا۔ متکلمین کا اپنا موقف امام ابن تیمیہؒ کے قول کے مطابق قرآن کریم کی نصرت ہی ہوتا تھا، یہ لوگوں کو قرآن وسنت سے دور رکھنے والے لوگ نہ تھے۔ اشیاء کی طبائع اور موجودات کے حقائق پر بحث کو فلسفہ کہتے ہیں، جبکہ علم الکلام صرف دینی حقائق پر بحث اور ان کے دفاع تک محدود ہے۔

اب ہم ذیل کے سطور میں مختصراً علم عقائد کی تعریف، موضوع، غرض وغایت اور حالات مصنف نذر قارئین کرتے ہیں۔

تعريف علم العقائد:

هو العلم بالعقائد الدينية عن الأدلة اليقينية.

یعنی علم عقائد، اسلامی عقائد کو یقینی دلائل کے ساتھ جاننے کا نام ہے، بالفاظ دیگر اس کی تعریف یہ ہے "العلم الذي يقوم على إثبات العقائد الدينية عن طريق الأدلة العقلية" یعنی علم کلام وہ علم ہے جس میں عقلی دلائل سے فلسفہ کے مقابلے میں اسلامی عقائد ثابت کیے جائیں۔

موضوعه:

موضوع میں متقدمین و متاخرین کا اختلاف ہے، متقدمین کہتے ہیں: "إن موضوعه ذات الله تعالى إذ يبحث فيه عن أعراضه الذاتية - أعني صفاته الثبوتية والسلبية وعن أفعاله."

اور متاخرین کا کہنا ہے کہ: "إن موضوعه المعلوم من حيث يتعلق به

إثبات العقائد الدينية، لأنه يبحث في هذا العلم عن أحوال الصانع من الوجود والقدم لاعتقاد ثبوتها."

غايته:

"أن يصير الإيمان والتصديق بالأحكام الشرعية محكما"

وغايته العظمى: "الفوز بسعادة الدارين، الدنيا بالأمان، والأخرى بالفوز بالجنان والنجاة من النيران المعدة لأهل الكفر والطغيان"

تو فاطمہ میں بہت کم ایسے حضرات ملیں گے، جو بیک وقت حدیث وفقہ اور اصول فقہ میں امام طحاویؒ کے علمی مقام تک پہنچے ہوں، امام طحاویؒ کو "أعلم الناس بمذهب أبي حنيفة" کہا گیا۔ امام طحاویؒ حفظ حدیث کے ساتھ ساتھ اجتہاد میں بھی بہت بلند مقام رکھتے تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: "امام طحاوی مجتہد منتسب تھے، محض امام ابوحنیفہؒ کے مقلد نہ تھے، کیونکہ آپ نے بہت سے مسائل میں ابوحنیفہ کے مذہب سے اختلاف کیا ہے۔"

امام طحاویؒ کے ہم عصر محدثین:

امام طحاویؒ کا زمانہ تیسری صدی ہجری ہے اور جتنے مصنفین صحاح ستہ کے ہیں، سب تیسری صدی ہجری کے ہیں، چنانچہ حضرت امام بخاری، امام مسلم، امام احمد بن حنبل، ترمذی، ابوداؤد، امام یحییٰ بن معین، نسائی، ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ، یہ سب ائمہ حدیث جو کہ کسی تعارف کے محتاج نہیں، امام طحاوی رحمہ اللہ کو ان کے ہم عصر ہونے کا شرف حاصل رہا۔ جن اساتذہ سے امام نسائی، امام ابن ماجہ اور امام مسلم رحمہم اللہ نے پڑھا ہے، ان میں سے بعض اساتذہ سے امام طحاویؒ نے بھی پڑھا ہے۔

تصانیف:

امام طحاویؒ کی مشہور تالیفات یہ ہیں۔

(۱) "مشكل الآثار" جس کا اصلی نام "مشكل الحديث" ہے۔
(۲) علیہ (دورۂ حدیث) میں داخلِ درس معانی الآثار جو کہ متن ہے، جبکہ اس کی شرح "شرح معاني الآثار" کے مصنف عبدالقادر القرشی (المتوفی ۷۷۵ھ) ہیں۔ (۳) "مختصر الطحاوي في الفقه الحنفي" (۴) "سنن الشافعي" (۵) "عقيدة الطحاوية" وغیرہ۔

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم الله الرحمٰن الرحيم

هذا ما رواه الإمام أبو جعفر الطحاوي في ذكر بيان اعتقاد أهل السنة والجماعة على مذهب فقهاء الملة أبي حنيفة النعمان بن ثابت الكوفي وأبي يوسف يعقوب بن إبراهيم الأنصاري وأبي عبد الله محمد بن الحسن الشيباني رضوان الله تعالى عليهم أجمعين وما يعتقدون من أصول الدين ويدينون به لرب العالمين.

یہ (ما حضر في الذهن) وہ تحریر ہے جس کو شیخ امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے، اہل سنت والجماعت کے اس عقیدہ کے تذکرہ کے سلسلے میں جو ملت اسلامیہ کے فقہاء (امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت الکوفی رحمۃ اللہ علیہ، ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم الانصاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو عبد اللہ محمد بن الحسن الشیبانی رحمہم اللہ) کے عقیدہ کے مطابق ہے، اور ان اصول دین (عقائد) کے تذکرہ کے سلسلے میں بیان ہوگا جن کا یہ حضرات عقیدہ رکھتے ہیں اور رب العالمین کے لئے جس کو وہ اپنا دین بنائے ہوئے ہیں۔

هذا: ما حضر في الذهن کی طرف اشارہ ہے۔ ما: بمعنی الذي.

الإمام: وہ عالم جس کی اقتداء کی جائے۔ (مصباح اللغات)

هذا ما رواه: عبارت کے شروع کا یہ حصہ یا تو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے کسی شاگرد نے بطور الحاق کے ذکر کیا ہے، کیونکہ اہل اللہ اپنی تعریف و توصیف بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ عبارت خود امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہو تحدیث بالنعمۃ کے طور پر اپنی ذات کے لئے تعریفی کلمات استعمال کئے۔

السنة: أي السيرة والطريقة المعتمدية ۔ والجماعة: اي أهل الجماعة

من الصحابة والتابعين ومن بعدهم من المجتهدين لنفي الحرج. الفقيه الملة پہلی مرتبہ أبي حنيفة جملہ ہے۔ وما يعتقدون کا "في ذكر بيان" بمعنی "بیان" پر عطف ہے أي في ذكر ما يعتقدون۔ ويدينون به کا عطف وما يعتقدون پر عطف تفسیری ہے کیونکہ دین بنانا اور عقیدہ رکھنا دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔

توحید

قال الإمام وبه قال الإمامان المذكوران رحمهما الله تعالى: نقول في توحيد الله معتقدين بتوفيق الله إن الله تعالى واحد لا شريك له.
امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین (امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ توفیق الٰہی کا عقیدہ رکھتے ہوئے توحید باری تعالیٰ کے متعلق ہم (عقیدۃً) یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

قال الإمام: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ وبه: أي بقول الإمام۔ الإمامان المذكوران: صاحبین۔

معتقدين: یہ نقول کی ضمیر فاعل سے حال ہے، اعتقاد سے مشتق ہے، اعتقد الأمر: پختہ یقین رکھنا۔

عقیدہ کی تعریف

العقيدة ما يقصد فيه نفس الاعتقاد دون العمل (التعريفات ص: ٨٠)

عقیدہ وہ ہے جس پر پختہ یقین کیا جائے جس کو انسان اپنا دین بنائے اور اس کا اعتقاد رکھے۔ عقیدہ ہی تمام دین کی اساس اور جڑ ہے۔

التوفيق

جعل الله تعالى فعل العبد وفعله موافقا لأمره ونهيه.

اللہ تعالیٰ جب بندہ کا قول اور فعل اپنے امر اور نہی کے موافق بنا دے، بس یہی توفیق ہے۔

توفیق کی مشہور تعریف بالفاظ دیگر یہ ہے "جعل الأسباب نحو المطلوب الخير" (دستور العلماء) نقول في توحيد الله الخ کا مطلب یہ ہوا کہ الاعتقاد بتوفيق من الله تعالى انه لا يقوتنا یعنی ہم اللہ کی توفیق کے سہارے پر اللہ کی توحید کے بارے میں بیان شروع کر رہے ہیں۔

نوٹ:۔ "إن الله" سے لے کر کتاب کے آخر تک یہ نقول کا مقولہ ہے، پھر "نقول" اپنے مقولہ سے مل کر مقول ہوا مصنف کے قول "قال الإمام" کا۔

"لا شريك له" "واحد" کی تشریح ہے یعنی "وحدانیت" ایک سلبی صفت ہے، جو تین انواع۔ وحدة في الذات، وحدة في الصفات اور وحدة في الافعال پر بولا جاتا ہے أي لا شريك له في ذاته ولا في صفاته ولا في افعاله۔ "واحد" کا استعمال "احد" کے معنی میں ہے، یعنی یکتا ولا ثانی اسماء حسنیٰ میں اسی معنی کے لحاظ سے ہے۔

(مصباح اللغات)

اللہ کے واحد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی ذات قابل تجزی نہیں، نہ صفات میں کوئی اس کا نظیر ہے نہ افعال میں کوئی اس کا شریک ہے۔ (مرقاۃ شرح مشکوۃ، بیان الفوائد ۱۵۵)

التوحيد: مصدر ہے، باری تعالیٰ کی وحدانیت کا اعتقاد۔

توحید کی اہمیت

عقیدہ توحید اسلام کا سب سے پہلا بنیادی عقیدہ ہے، یہی عقیدہ دین کی اصل بنیاد ہے، کیونکہ توحید ایک بدیہی اور فطری امر ہے، یوں تو شرح صدر کے بہت سے اسباب ہیں مگر شرح صدر کا سب سے قوی اور اہم سبب توحید ہے۔ (زاد المعاد)

حقیقی اور خالص توحید کا فخر صرف اسلام کو حاصل ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد توحید ہے، تمام انبیاء کا سب سے پہلا اور اہم سبق اللہ کی توحید ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین کا اجماع عقیدۂ توحید پر رہا ہے، فرمایا: ﴿وما أرسلنا من قبلك من رسول إلا نوحي إليه أنه لا إله إلا أنا فاعبدون﴾ [انبیاء: ۲۵] قرآن حکیم میں

ہے۔ دو سو آیات اور سو احادیث نبویہ میں عبادت کو صرف ایک اللہ کا خاصہ بتلایا گیا ہے۔ توحید کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نبوت کے بعد کی زندگی میں صرف توحید سمجھانے کے لئے تیرہ برس صرف کئے اور مدنی زندگی میں باقی شریعت کے لئے دس سال لگائے۔

ولا شيء مثله ولا شيء يعجزه ولا إله غيره

نہیں ہے اس کی طرح کوئی (اس جیسی کوئی چیز نہیں) اور کوئی چیز اللہ کو عاجز نہیں کرسکتی اور اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

ولا شيء مثله: باری تعالیٰ کے اس قول ﴿ليس كمثله شيء وهو السميع البصير﴾ کی طرف اشارہ ہے، نیز ماقبل صفت وحدت کی تاکید ہے، کیونکہ مثل کا نہ ہونا وحدت کی دلیل ہے، اگر اللہ کا مثل ہوتا تو پھر اللہ واحد بھی نہ ہوتا۔ حاصل یہ کہ نہ ذات میں اس کا کوئی مماثل ہے نہ صفات میں نہ افعال میں، بے شک وہ ہر چیز کو دیکھتا سنتا ہے مگر اس کا دیکھنا سننا بھی مخلوق کی طرح نہیں، نہ اس کی کیفیت بیان کی جاسکے۔ وہ مخلوق کی مشابہت ومماثلت سے بالکلیہ پاک اور مقدس ومنزہ ہے تو پھر اس کی صفات کی کیفیت کس طرح سمجھ میں آجائے۔ (ملخص از فوائد عثمانیہ)

اللہ کی ذات وصفات کو اپنی ذات وصفات پر قیاس کرنا نادانی ہے۔ اللہ کی ذات وصفات کے متعلق زیادہ بحث وتفتیش کرنا اس کی کیفیتوں میں غور وخوض کرنا کج فہمی کی دلیل ہے، غرضیکہ اللہ تعالیٰ علیم وخبیر وبصیر ہے مگر ہماری طرح نہیں، بدون مغز کے ادراک کرتا ہے، وہ بغیر کان کے سنتا ہے اور بغیر آنکھ کے دیکھتا ہے، بدون زبان کے کلام کرتا ہے، ہماری طرح ان اعضاء وجوارح کے محتاج نہیں۔ "لا شيء مثله" سے مشبہ ومعطلہ کی تردید ہے۔

ولا شيء يعجزه: عجز اہل سنت کے ہاں امر وجودی ہے، تو قدرت کی ضد ہے، ارشاد باری ہے ﴿وما كان الله ليعجزه من شيء في السموات ولا في الأرض إنه كان عليما قديرا﴾ (فاطر: ۴۴)

اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز (قوت والی) اس کو عاجز کر سکے، نہ آسمان میں اور نہ زمین میں (کیونکہ) وہ بڑے علم والا اور بڑی قدرت والا ہے، پھر معاذ اللہ عاجز ہونا کیسے متصور ہو۔

ولا إله غيره : ولا إله اي في الوجود ـ إله بروزن فعال بمعنی اسم مفعول مألوہ کے ہیں، یعنی معبود، ہر قوم کے نزدیک جس کی بندگی کی جائے وہ اِلٰہ ہے، خواہ معبود برحق ہو یا معبود باطل، اس جملے میں کلمۂ توحید "لا إله إلا الله" کی طرف اشارہ ہے۔

قديمٌ بلا ابتداءٍ ، دائمٌ بلا انتهاءٍ، لايفنى ولا يبيد.
اللہ تعالیٰ ایسا قدیم ہے، جس کی ابتداء نہیں اور ہمیشہ رہنے والا ہے، جس کی انتہا نہیں، وہ ذات نہ فنا ہوگی اور نہ ہی ختم ہوگی۔

قديم: صفت سلبیہ ہے، کیونکہ قدیم کا معنی ہے، ایسا موجود جس کی بدایت نہ ہو، قدیم اور ازلی میں پھر فرق یہ ہے کہ قدیم ازلی سے اخص ہے، کیونکہ قدیم کی تعریف ہے "موجود لا أول له" ازلی کی تعریف ہے "ما لا أول له أعم من أن يكون وجوديا كذات مولنا عزوجل او عدميا كصفتنا الأزلي".

بلا ابتداء: کا مطلب ہے، کہ مسبوق بالعدم نہ ہو۔ دائم: أي باق.

بلا انتهاء: یعنی اس پر عدم کا طاری ہونا محال ہے، "لأن من ثبت قدمه امتنع عدمه" دائم بلا انتهاء: سے صفت بقاء مراد ہے اور یہ بھی صفت سلبیہ ہے، کیونکہ اس کا حاصل یہ نکلا "باقي ليس منحوفا بعدم" اگلی عبارت "لا يفنى ولا يبيد" اسی صفت بقاء کی تفسیر وتاکید ہے۔ لا يفنى (س بمعنی کلفنا) : معدوم ہونا۔ یقال: فنى الشيء. اذا زال وذهب اثره" یہاں معنی ہے "أي لا يزول بقاءه"

ولا يبيد: باد يبيد بيدًا وبيودةً: ہلاک ہونا، یقال بادت القبيلة : اذا انقطعت : یہاں مراد ہے أي "لا ينقطع بقاؤه" دراصل فناء اور بید متقارب المعنی ہیں۔ جو تاکید کے لئے ہیں۔

فائدہ۔ "قديم بلا ابتداء، دائم بلا انتهاء" کا مفہوم اللہ کے اس ارشاد میں

ہے۔ ﴿وهو الأول والآخر﴾ (الحدید: ۳)

یہی مفہوم مسلم شریف کی حدیث میں بھی ہے۔ "اللّٰهم أنت الأول فليس قبلك شيء وأنت الآخر فليس بعدك شيء" (رقم الحدیث ۲۷۱۳)

واضح رہے کہ "قديم" بھی "اول" کے معنی میں ہے، مگر چہ لفظ قدیم کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر قرآن وحدیث میں وارد نہیں، مگر اس کے باوجود اللہ پر اس کا اطلاق اس لئے درست ہے کہ اس کا اطلاق اجماع سے ثابت ہے اور اجماع کا حجت ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ (شرح العقائد)

لفظ موجود، واجب اور لفظ خدا کا اطلاق بھی اسی قبیل سے ہے۔

> ولا يكون إلا ما يريد.
>
> اور نہیں ہوتا ہے مگر وہی جس کا اللہ ارادہ کرتا ہے۔

ارادہ کی تعریف

ولا يكون: أي ولا يوجد في ملكه إلا ما يريد، وهذا ما اشتهر من السلف: أن ما شاء الله كان وما لم يشأ لم يكن۔ ارادہ کی تعریف یہ ہے کہ ارادہ "أحد المقدورين" کے وقوع کو ترجیح دینے والی صفت کا نام ہے مثلاً اللہ تعالیٰ حامد کو لڑکا دینے پر قادر ہے اور نہ دینے پر بھی قادر ہے یعنی اگر چاہے تو دے اور اگر نہ چاہے تو نہ دے، تو جب لڑکا دینا اور نہ دینا دونوں اللہ کا مقدور تھا، پس جس چیز نے دینے کو نہ دینے پر ترجیح دی، وہی ارادہ ہے اور اسی کو مشیت بھی کہتے ہیں، کیونکہ ارادہ اور مشیت دونوں ایک ہی صفت ہیں، غرضیکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے ارادہ سے ہی ہوتا ہے ازل میں جو کچھ ارادہ کرلیا تھا اب اسی کے مطابق ہو رہا ہے اور ابدا اسی کے مطابق ہوتا رہے گا۔ ﴿فعال لما يريد﴾ (البروج) جو ارادہ کرتا ہے، کر گزرتا ہے۔ تمام افعال عباد اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے واقع ہوتے ہیں، خواہ وہ افعال از قبیل خیر ہوں یا از قبیل شر ہوں (کوئی چیز بھی اللہ کے ارادہ واختیار سے باہر نہیں) البتہ معتزلہ اور قدریہ کا کہنا یہ ہے کہ افعال قبیحہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے صادر نہیں ہوتے، ان کا اصول یہ ہے "إرادة القبيح قبيح" ہمارا اصول یہ ہے کہ ارادہ قبیح قبیح نہیں، بلکہ

کسب القبیح، قبیح، نیز ارادہ اور رضا کو بھی مستلزم نہیں، مثلاً کافر سے کفر ہی کا ارادہ اللہ نے کیا، یعنی اللہ نے ارادہ کیا کہ فلاں سے اختیاری طور پر کفر صادر ہوگا، مگر اس فلاں کے کفر پر راضی نہیں۔

لاتبلغه الأوهام ولاتدركه الأفهام.

انسانی خیالات اور اوہام اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی عقول انسانی اس کا ادراک کرسکتی ہیں۔

اوہام: کا مفرد وھم ہے، دل میں جو خطرہ گزرے اس کو وھم کہتے ہیں۔ قال في الصحاح: توهمت الشيء ظننته: میں نے خیال وگمان کیا۔ أفهام، فهم کی جمع ہے۔ فهمت الشيء أي علمته: میں سمجھ گیا۔ أي لاينتهي إليه وهم ولايحيط به علمٌ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور حقیقت سب کے تخیلات اور عقلوں سے بالاتر ہے، بندوں کا علم اس کو محیط نہیں۔ جیسے ارشاد ہے: ﴿ولا یحیطون به علماً﴾ (طہ: ۱۱۰)

وہم اور علم سے اللہ کی ذات کا احاطہ نہیں ہوسکتا، البتہ اللہ تعالیٰ کی معرفت صفات الٰہیہ سے ہوتی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں "ترقي من الأدنى إلى الأعلى" ہے، کیونکہ جب عقل انسانی قاصر ٹھہری تو قوت وہمیہ اور قوت تخیلہ کا بدرجہ اولیٰ عجز معلوم ہوگیا۔

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم ۔۔۔ وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم وخواندہ ایم

مجلس تمام گشت وبپایاں رسید عمر ۔۔۔ ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

ولا يشبهه الأنام.

مخلوق میں سے کوئی اس کا مشابہ نہیں۔

الأنام: أي المخلوقات۔ وهو اسم جمع لا واحد له من لفظه۔ فرقہ مشبہہ کے لوگ اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ قرار دیتے ہیں اور اس کے لئے جسم اور جہت کو ثابت کرتے ہیں ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ مخلوق کے اجسام کی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے لئے خون، گوشت اور ہڈیوں کا جسم رکھتے ہیں اور بعض نے کہا کہ: اللہ کا جسم تو ہے مگر

مخلوق کے اجسام کی طرح خون اور گوشت سے مرکب نہیں ہے، "لا یشبہ الأنام" سے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے فرقہ مشبہ کی تردید کی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال میں کوئی بھی شئی اللہ کا مماثل اور مشابہ نہیں۔ "الفقہ الاکبر" میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اس سلسلے میں اور زیادہ واضح ہے، آپ فرماتے ہیں: "لا یشبہ شیئا من خلقہ ولا یُشبہہ شیء من خلقہ" یعنی اللہ تعالیٰ کسی بھی مخلوق سے مشابہت نہیں رکھتا اور نہ ہی کوئی مخلوق اس سے مشابہت رکھتی ہے۔ آگے فرمایا: "وصفاتہ کلہا خلاف صفات المخلوقین یعلم لا کعلمنا ویقدر لا کقدرتنا ویری لا کرؤیتنا" غرضیکہ صرف اسمی اشتراک تو ہے، کیونکہ انسان بھی دیکھنے سننے والا ہے لیکن اللہ کا سننا دیکھنا ازلی، لامحدود اور پائیدار ہے، جبکہ انسان کا ایسا نہیں۔

حیّ لا یموت قیوم لا ینام.
اللہ تعالیٰ ایسا زندہ ہے، جس کو کبھی موت نہیں آسکتی، ایسا سنبھالنے والا ہے تمام عالم کا، جس کو کبھی نیند نہیں آسکتی۔

حیّ: کے معنی ہیں زندہ، زندگی کی صفت اللہ کے لئے ثابت ہے دائماً، کمالات وجود یہ میں سب سے پہلے حیات ہے۔ اسماء الٰہیہ میں سے یہ لفظ ذکر کرنا مقصود ہے کہ وہ حقیقی زندگی کا مالک ہے وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے وہ موت سے بالاتر ہے۔ "وکما ان حیاتہ ازلیۃ فہی ابدیۃ کما نص علیہا بقولہ: "لا یموت".

قیوم: صیغہ مبالغہ "قائم" سے، "قیام" بروزن فعال اور قیوم بروزن فیعول مبالغہ کے صیغے ہیں، ان کے معنی ہیں۔ "القائم بنفسہ المقیم لغیرہ بالتدبیر والحفظ" یعنی وہ جو خود قائم رہ کر دوسروں کو قائم رکھتا اور سنبھالتا ہے۔ "قیام" سے زیادہ مبالغہ "قیوم" کے اندر ہے اس لئے کہ واو نے اسے اقویٰ بنایا۔ "قیوم" حق تعالیٰ کی خاص صفت ہے، جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہو سکتی، اس لئے کسی انسان کو "قیوم" کہنا جائز نہیں، جو لوگ عبدالقیوم کے نام کو بگاڑ کر صرف قیوم بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔

(معارف القرآن ج ۱، ص ۶۱۳)

حیّ: سے خدا کا واجب الوجود ہونا بیان کیا، یعنی بذاتہ اور بنفسہ واجب

الوجود ہے اور "قیوم" سے خدا کا واجب الوجود ہونا بیان کیا۔ یعنی دوسروں کو وجود اور حیات دینے والا اور عطا کرنے والا ہے۔

لاینام: کمال حیات اور کمال قیومیت کی دلیل ہے۔ کیونکہ جس کو تعب، اونگھ اور نیند لاحق ہوتی ہے وہ یقیناً "غیر تام الحیات ناقص الحفظ والقیام" ہوگا۔

خالق بلاحاجة رازق بلامؤونة

بغیر کسی اپنی ضرورت اور حاجت کے اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا خالق ہے وہ بغیر کسی کلفت ومشقت کے ان کا رازق ہے۔

خالق: أي لجميع خلقه بلاحاجة إليهم. رازق: أي لهم، فضلاً منه. بلامؤنة: ثقله. المؤونة: خوراک، بخشی بوجھ، جیسا کہ فرمان ارشاد ہے: ﴿ما أريد منهم من رزق وما أريد أن يطعمون﴾ (الذاريات ۵۶،۵۸) ﴿والله الغني وأنتم الفقراء﴾ (محمد ۳۸) ﴿وهو يطعم ولا يطعم﴾ (الانعام ۱۴)

حاصل یہ کہ حاجت مئونت یہ سب کمزوری اور نقص کی علامات ہیں۔ واللہ تعالیٰ منزہ عنہ

مُمیت بلا مَخافة، باعث بلا مشقة.

(وقت مقررہ پر) وہ سب کو موت دینے والا ہے، بغیر کسی خوف کے، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھانے والے ہیں بغیر کسی دشواری کے۔

مُمیت: من الإماتة، موت دینے والا ہے۔ مَخافة: (س) خوفاً وخیفاً ومَخافة: گھبرانا۔ المشقة: بفتح المیم وکسرھا: دشواری، محنت، ج: مشاق ومشقات.

نوٹ: فلاسفہ موت کو "عدمی" سمجھتے ہیں، حالانکہ موت وجودی ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: ﴿الذي خلق الموت والحيوة﴾ (الملک ۲) عدمی چیز کیونکر مخلوق ہو سکتی ہے؟ پتہ چلا کہ موت وجودی ہے۔

> ما زال بصفاته قديماً قبل خلقه لم يزدد بكونهم شيئاً لم يكن قبلهم من صفته، وكما كان بصفاته أزلياً كذلك لا يزال عليها أبدياً.
>
> اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے قبل اپنی صفات (صفات ذات، وصفات فعل) کے ساتھ ہمیشہ سے قدیم رہا، مخلوق کے وجود کے سبب سے اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی ایسی صفت کا اضافہ نہیں ہوا، جو صفت مخلوق کے وجود سے پہلے نہ ہو، جیسے وہ اپنی صفات میں ازلی تھا، ایسے ہی ہمیشہ انہی صفات کے ساتھ موصوف رہے گا۔

ما زال بصفاته: "ما زال" افعال ناقصہ میں سے ہے۔ "قدیماً" اس کی خبر ہے۔ **من صفاته:** صفات کی دو قسمیں ہیں: صفت ذات اور صفات افعال۔ صفات ذات: ان صفات کو کہتے ہیں، جن کی ذات باری تعالیٰ سے نفی، جہل کو اور قدرت کی نفی، عجز کو مستلزم ہو اور جہل و عجز دونوں از قبیل نقائص ہیں اور صفت افعال: ان صفات کو کہتے ہیں جن کی ذات واجب سے نفی موجب نقص نہ ہو۔ مثلاً اعزاز، اذلال اور اغناء وغیرہ یہاں مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صفات کمال (صفات ذات وصفات افعال) کے ساتھ ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا، مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اس کے کسی وصف میں اضافہ نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ کے ثبوت میں مخلوق کا کوئی دخل نہیں ہے۔ بہر حال جیسے ذات باری تعالیٰ ازلی ابدی ہے ایسے ہی صفات باری تعالیٰ بھی ازلی اور ابدی ہیں ورنہ صفات کا ذات باری سے انفکاک لازم آئے گا۔

ما زال بصفاته: یہ دراصل معتزلہ، جہمیہ اور بعض اہل تشیع وغیرہ کی تردید ہے، جن کا خیال یہ ہے کہ: "إنه تعالى صار قادراً على الفعل والكلام بعد أن لم يكن قادراً عليه، لأنه صار الفعل والكلام ممكناً بعد أن كان ممتنعاً"

ہیں اور مخلوق کے وجود سے قبل بھی "خالق" کے ساتھ متصف ہیں۔

وکما انه محیي الموتى بعد ما احیاهم، استحق هذا الاسم قبل إحیاءهم، کذلک استحق اسم الخالق قبل إنشائهم

جیسا کہ وہ مردوں کو زندہ کرنے کے بعد "محیي" (زندہ کرنے والا) کہلاتا ہے۔
اسی طرح وہ زندہ کرنے سے پہلے بھی اس نام کا مستحق ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرنے اور ان کو وجود بخشنے کے بعد "محیي" (زندہ کرنے والا) کی صفت سے موصوف ہیں، اسی طرح وہ زندہ کرنے سے قبل بھی اسی نام سے موصوف تھا۔ مثال سے اس کو اس طرح سمجھیں کہ "کاتب" اس کو کہتے ہیں جو لکھے مگر جو اس وقت نہیں لکھ رہا ہے، لیکن اس میں "کتابت" کا ملکہ اور استعداد ہے، پھر بھی اس کو کاتب کہتے ہیں، یہی حال قاری اور مدرس کا ہے۔

ذلک بانه علی کل شيء قدیر، وکل شيء إلیه فقیر وکل أمر علیه یسیر لا یحتاج إلی شيء، لیس کمثله شيء، وهو السمیع البصیر۔

یہ اس لئے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز اس کی محتاج ہے، ہر کام اس کے لئے آسان ہے، وہ کسی چیز کا محتاج نہیں، اس کی کوئی مثل نہیں، وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

ذلک: اي ثبوت صفاته في الأزل قبل خلقه۔ یہ بات عجیب کی معلوم ہو رہی تھی کہ ساری صفات باری ازلی ہیں اور مخلوق کی تخلیق سے پہلے ہی وہ "خالق" ہے۔ "ذلک" سے اس تعجب کو ختم کیا جا رہا ہے۔

بانه: اي بسبب انه علی کل شيء قدیر:

معتزلہ کا خیال یہ ہے کہ جس چیز پر بندہ کو قدرت ہے بعینہ اس چیز پر اللہ تعالیٰ کو قدرت نہیں، اس جملے سے ان کی تردید ہو رہی ہے، کیونکہ اہل سنت کے ہاں اللہ ہر شئی پر قادر ہے، چنانچہ ہر ممکن اللہ کا مقدور ہے۔ جہاں تک تعلق ہے محال لذاتہ کا مثلاً "کون الشيء الواحد موجودًا ومعدومًا في حال واحدة" تو وہ باتفاق عقلاء شيء نہیں کہلاتا، لہذا تحت القدرت بھی داخل نہیں۔ "ومن هذا الباب خلق مثل نفسه

وإعدادہ نفسہ وأمثال ذلک من المحال ۔ ایمان معدوم ممکن کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ شیء ہے یا نہیں؟ تحقیق یہ ہے کہ "إن المعدوم الممكن ليس بشيء في الخارج ولكن الله يعلم مايكون قبل أن يكون ، ويكتبه وقد يذكره ويخبر به ، فيكون شيئا في العلم والذكر والكتاب لا في الخارج"۔

ولايحتاج إلى شيء "ويحتاج إليه كل شيء مثلاً فإن زلزلة الساعة شيء عظيم یعنی قیامت کا زلزلہ خارج کے اعتبار سے کوئی شئی نہیں لیکن علم الٰہی میں شئی ہے غرضیکہ اللہ تعالیٰ محتاج الیہ ہے محتاج نہیں ہے۔

ليس كمثله شيء : بظاہر اللہ کی مثل کی مثل کی نفی ہو رہی ہے حالانکہ مقصود اللہ تعالیٰ کی مثل کی نفی ہے۔ اس اشکال کے جواب میں اکثر کا قول تو یہ ہے کہ (۱) کاف برائے تاکید زائد ہے والمعنی ليس مثله شيء (۲) کاف کو زائد نہ ہو بلکہ خلاف الاصل ہے، بلکہ مثل بمعنی وصف کے ہیں، أي ليس كوصفه شيء یا مثل بمعنی ذات کے ہیں أي ليس كذاته شيء۔ (۳) یا ظاہری معنی ہی مراد لیا جائے مگر یہ بطور مبالغہ پر محمول ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ بالفرض اگر اللہ کی مثل ہو تو اس کی بھی مثل نہیں چہ جائیکہ اللہ کی مثل ہو۔

ليس كمثله شيء سے مشبہ کی تردید ہوگئی، وهو السميع البصير سے معطلہ کی تردید ہے۔ فهو تعالى موصوف بصفات الكمال ، وليس له فيها شبيه فالمخلوق وإن كان يوصف بأنه سميع بصير ، فليس سمعه وبصره كسمع الرب وبصره . آئی ذریعہ سے قوت سامعت کے باوجود اللہ تعالیٰ کانوں سے پاک ہے، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھتا ہے لیکن وہ مخلوق جیسی آنکھوں سے پاک ہے۔

خلق الخلق بعلمه وقدر لهم أقدارا وضرب لهم آجالا .
اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس حال میں پیدا کیا کہ اللہ کو مخلوق کا علم تھا، اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تقدیریں مقرر کیں، اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے لئے موتیں (آخری وقت) مقرر کیں۔

خلق: أي أوجد وأنشأ وابدع الخلق: أي المخلوق بعلمه: في سابقته وقوله: "بعلمه" في محل نصب على الحال، أي خلقهم عالمابهم۔ فمن أثبت العلم، فقد نفى الجهل، ومن نفى الجهل لم يثبت العلم.

غرض یہ کہ اللہ کے لئے صفت علم کا اثبات ضروری ہے، یہ نہیں کہنا چاہئے کہ "واللہ لایجھل" کیونکہ جہالت کی نفی علم کے لئے مستلزم نہیں، البتہ اثبات علم نفی جہالت کو مستلزم ہے۔ بہرحال اللہ تعالی نے مخلوق کو اپنے علم سے پیدا کیا، کیونکہ جہل کے ہوتے ہوئے ایجاد الاشیاء محال ہے۔

وقدّر لهم أقدارا من خير أو شر۔ "اقدار" "قدّر" کا مفعول بہ ہے، مفعول مطلق نہیں، کیونکہ یہ مصدر نہیں، بلکہ "قدر" کی جمع ہے۔

تقدیر کی تعریف: "وهو تعيين كل مخلوق بمرتبته التي توجد من حسن وقبح ونفع وضرر ومايحيط به من مكان وزمان، ومايترتب عليه من ثواب أو عقاب" (شرح الفقه الأكبر)

قال تعالى: ﴿وخلق كلّ شيء فقدّره تقديرا﴾ (الفرقان:۲)

"وفي صحيح مسلم عن عبدالله بن عمر رضي الله عنهما، عن النبي ﷺ أنه قال: "كتب الله مقادير الخلق قبل أن يخلق السماوات والأرض بخمسين ألف سنة وكان عرشه على الماء" أخرجه مسلم في صحيحه، رقم (۲۶۵۳) كتاب القدر".

حاصل یہ ہے کہ ہر مخلوق کو جن صفات کے ساتھ جس زمان ومکان میں موجود ہونا ہے، وہ سب ازل میں پہلے سے متعین کردینے کا نام تقدیر ہے۔ تقدیر کا یہ مسئلہ اسلام کا قطعی عقیدہ ہے، اس کا منکر کافر ہے۔

وضرب لهم آجالا:

یعنی خلائق کی ایک مدت اور میعاد اللہ کے علم میں مقرر ہے۔ جب میعاد پوری ہوکر اس کا وقت پہنچ جائیگا، ایک سیکنڈ تقدیم وتاخیر کی گنجائش نہیں ہوگی۔ "آجال": اجل کی

جمع ہے "میعاد اور وقت مقررہ" کو کہتے ہیں۔

ثم يخف عليه شيء قبل أن خلقهم وعلم ما هم عاملون قبل أن يخلقهم.
مخلوق کی پیدائش سے پہلے بھی اللہ سے مخلوق کا کوئی فعل پوشیدہ نہیں، وہ ان کے ان اعمال سے باخبر تھا، جو وہ کرنے والے ہیں۔

اس میں روافض اور قدریہ کی تردید ہورہی ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کی تخلیق و ایجاد سے قبل اس کا علم نہیں، پیدا کرنے اور موجود کرنے کے بعد اس کو جانتا ہے۔ یہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ "ما کان" "ما یکون" سب جانتا ہے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے بھی اللہ ان کی پوری واقفیت رکھتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کا بھی خالق ہے لہٰذا وہ بندوں کی تخلیق سے قبل ان کاموں کو جانتا ہے جن کو بندے کریں گے۔ الغرض قبل از وقوع حوادث، ہر ایک چیز سے فرداً فرداً اور تفصیلاً اللہ تعالیٰ کا علم محیط اور ازلی، متعلق اور وابستہ ہے، نہ یہ کہ وقوع کے بعد ان سے اللہ تعالیٰ کا علم وابستہ ہوتا ہے، جیسا کہ روافض اور قدریہ کا خیال ہے۔

(نوٹ) قدری فرقہ (منکرین تقدیر) معتزلہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ (شرح مواقف: طبع لکھنو، ۷۲۷)

وأمرهم بطاعته ونهاهم عن معصيته.
اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اپنی فرمانبرداری کا حکم دیا ہے اور لوگوں کو اپنی نافرمانی سے روکا ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلق اور قدر کے بعد امر و نہی کا ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اپنی عبادت کی خاطر پیدا فرمایا ہے اور ان کو مکلف بنایا ہے۔ کما قال تعالیٰ ﴿وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون﴾ (الذاريات: ۵۶) گویا پچھلی عبارت میں "خلق" اور اس عبارت میں "امر" کا ذکر ہے۔ خلق اور

امر دونوں کا ذکر آیت ﴿ألا له الخلق والأمر﴾ (الاعراف: ٥٤) میں بھی ہے۔

وكل شيء يجري بتقديره ومشيته ، ومشيته تنفذ، لامشيئة للعباد إلاماشاء لهم،فما شاء لهم كان، ومالم يشأ لم يكن. کائنات کی ہر شئ اس کی تقدیر اور اس کے ارادے کے مطابق جاری ہے اور اسی کی چاہت چلتی ہے، بندوں کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا مگر جو ان کے لئے اللہ نے چاہا تو اللہ نے جو ان کے لئے چاہا وہ ہوا اور جو نہیں چاہا وہ نہیں ہوا۔

فما شاء لهم كان: اي وُجد وما لم يشأ لهم لم يكن: اي لم يوجد. وفي هذا رد على المعتزلة القائلين: إنما يريد الله من أفعال العباد ما كان طاعة والمعاصي والقبائح واقعة بإرادة العبد على خلاف إرادة الله تعالى. وقد قال تعالى: ﴿وماتشاء ون إلا أن يشاء الله﴾ (الدهر: ۳۰)

وهم قد شاؤا المعاصي؛ فكانت بمشيئة الله تعالى بهذا النص

(شرح عقيدة الطحاوية للميداني)

ومن أضل سبيلاً وأكفر ممن يزعم أن الله شاء الإيمان من الكافر والكافر شاء الكفر فغلبت مشيئة الكافر مشيئة الله، تعالى الله عما يقولون علواً كبيراً.

حاصل یہ ہے کہ افعال عباد (از قسم طاعت ومعصیات ہر دونوں) اللہ ہی کے ارادے سے واقع ہوتے ہیں، اس میں معتزلہ کی تردید ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ افعال قبیحہ اللہ کے ارادے سے صادر نہیں ہوتے، بلکہ بندوں کے اچھے افعال اللہ کے ارادے سے صادر ہوتے ہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اللہ کی مشیت وارادہ، اللہ کی رضا کو مستلزم نہیں۔ کافر کا کفر بھی تقدیر الٰہی کے مطابق ہے اور اس کی مشیت وارادہ کے ماتحت ہے مگر اس کے ساتھ رضاء الٰہی وابستہ نہیں۔ کما قال تعالیٰ ﴿ولا يرضى لعباده الكفر﴾ (الزمر: ۷) کیونکہ ایجاد کفر وشر اور کسی کے کفر کا ارادہ کرنا، اس کو مستلزم نہیں کہ اس شر اور معصیت کا ارتکاب بھی پسندیدہ ہو۔ اہل سنت کہتے ہیں: خلق قبیح قبیح ہے اور نہ ارادہ قبیح قبیح ہے،

کا مخالف ہو سکے گا۔

لا رادّ لقضائه ولا معقب لحكمه ولا غالب لأمره اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو کوئی ٹالنے والا نہیں اور اللہ کے حکم کو کوئی موخر کرنے والا نہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے امر اور حکم پر کوئی غالب ہونے والا ہے۔

أي لا يرد قضاء الله رادّ ولا يؤخر حكمه مؤخرٌ ولا يغلب أمره غالبٌ. معقب: يقال: عقب الحاكم على حكم من كان قبله إذا حكم بعد حكمه بخلافه.

الحاصل اللہ کا تکوینی حکم و فیصلہ اٹل ہے۔ کوئی طاقت اس کو ٹال سکتی ہے، نہ موخر کر سکتی ہے اور نہ ہی اللہ کے امر اور حکم پر کوئی غلبہ کر سکتا ہے۔

آمنا بذلك كله وأيقنا أن كلًا من عنده ہم ان سب باتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

بذلك: أي القضاء المقدور. كله: خيره وشره، حلوه ومره.

الإيقان: الاستقرار من يقن الماء في الحوض إذا استقر. كلًا: کل کی تنوین مضاف الیہ کے عوض ہے أي كل كائن محدث من عند الله. أي بمشيته وإرادته

رسالت

وإن محمدًا عبده المصطفى ونبيه المجتبى ورسوله المرتضى. بلاشبہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور اس کے چنے ہوئے نبی اور اس کے پسندیدہ رسول ہیں۔

وإن محمدًا: "إنّ" کسرہ کے ساتھ ہے اور "إن الله واحد لا شريك له" پر عطف ہے اور یہ سب "نقول" کے مقول ہیں۔ أي نقول في توحيد الله إن الله واحد لا شريك له ونقول إن محمدًا ... الاصطفاء والاجتباء

ولا ترتضيه: مقارب "آپ ہی" محمدا: هو علم منقول من اسم مفعول المضعف فيسمى بذلك لكثرة خصاله الحميدة أو لأنه يحمد في السماء والأرض ولم يسم به أحد قبله. (شارح میں ان) "محمد" کے معنی ہر لحاظ محمود ہے۔

عبده: قدمه على الرسالة امتثالاً لقوله ﷺ كما في الحديث الصحيح "ولا تطروني كما أطرت النصارى عيسى بن مريم وإنما أنا عبده ورسوله فقولوا عبد الله ورسوله" (رواہ البخاری ومسلم)

ولأنه أحب الأسماء إلى الله تعالى وذكر الله نبيه ﷺ باسم العبد في أشرف المقامات فقال ﴿سبحان الذي أسرى بعبده﴾ (الاسراء) إلى غير ذلك من الآيات. نبيه: من النبوة وهي الرفعة أي إن له عند الله رتبة شريفة ومكانة منيعة أو من النبأ بالهمزة وقد تسهل، وهو الخبر أي يكون النبي مخبراً عما بعثه الله تعالى به ومنبئاً بما أطلعه الله تعالى عليه.

رسول کی تعریف: إنسان بعثه الله تعالى إلى الخلق لتبليغ الأحكام.

(شرح عقائد)

نبی اور رسول میں فرق

رسول وہ ہے جسے نئی شریعت کی تبلیغ کے لئے بھیجا گیا ہو بخلاف نبی کے کہ وہ عام ہے جسے نئی شریعت کے ساتھ مبعوث کیا گیا وہ بھی نبی ہے اور جسے لوگوں کو شریعت سابقہ پر قائم رکھنے کے لئے بھیجا گیا وہ بھی نبی ہے لہٰذا نبی عام ہے اور رسول خاص ہے۔

(ایضاح الفوائد)

خاتم الأنبياء وإمام الأتقياء وسيد المرسلين وحبيب رب العالمين

اور آپ ﷺ آخری نبی سب متقیوں کے پیشوا اور سب رسولوں کے سردار اور اللہ رب العالمین کے حبیب ہیں۔

آپ ﷺ خاتم الانبیاء ہیں، آپ ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نیا نبی پیدا نہیں ہوگا اور کوئی بھی نیا نبی نہیں آئے گا۔ ہاں عیسیٰ علیہ السلام جو کہ سابق انبیاء میں سے ہیں اور پہلے سے نبی بنائے جا چکے ہیں، وہ آسمان سے نزول فرما کر تشریف لائیں گے لیکن اب کہ مرتبہ جب عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو آپ کی نبوت موقوف ہوئی مسلوب نہیں ہوگی، کیونکہ نبی اور رسول منصب نبوت ورسالت سے کبھی بھی معزول نہیں کیے جاتے ہیں، ان کی تخلیق بحیثیت نبی ہوتی ہے، نبی وفات کے بعد بھی نبی ہوتا ہے لیکن عیسیٰ علیہ السلام شریعت محمدی کے متبع اور داعی ہوں گے۔ بہرحال اہل اسلام آپ ﷺ خاتم النبیین کے بعد کسی بھی شخص کے لئے نبوت کی کسی بھی قسم (ظلی، بروزی اور غیر تشریعی) کے قائل نہیں۔ ختم نبوت کے عقیدہ پر قرآن کریم کی سو آیات، دو سو احادیث دلالت کرتی ہیں، اجماع امت اس پر مستزاد ہے، احادیث ختم نبوت حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ختم نبوت کامل" مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ۔

الإمام: الإمام الذي يؤتمّ به أي يقتدون به. الأتقياء: جمع تقي وهو من اتصف بالتقوى، قال البيضاوي: التقوى في عرف الشرع اسم لمن يقي نفسه عما يضره في الآخرة، وكل من اتبع الرسول، واقتدى به، فهو من الأتقياء. وسيد المرسلين: أي سيد جميع المرسلين، قال ﷺ: أنا سيد ولد آدم، ولا فخر. (ترمذی،۳۶۱۸)

یہاں یہ اشکال پیش آسکتا ہے کہ جب آپ ﷺ انبیاء کے سردار ہیں اور انبیاء سے افضل ہیں، حالانکہ حدیث میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "لاتفضلوا بين الأنبياء."

(بخاری،۳۴۱۴)

ایسے ہی فرمایا: "لاتفضلوني على موسى." (بخاری:۲۴۱۱) اور فرمایا: "لاينبغي لعبد أن يقول أنا خير من يونس بن متى." ان احادیث میں بعض انبیاء کو بعض پر فضلیت دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

جواب یہ ہے کہ: قرآن وحدیث کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاء کی بعض پر

فضیلت معلوم ہوتی تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے، رہی حدیث "لا تفضلوا بین الأنبیاء" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دلیل کے بغیر اپنی رائے سے بعض کو بعض پر فضیلت نہ دو، رہا آپ کا یہ ارشاد "لا ینبغي لعبد ..." تو یہ اس وقت سے متعلق ہے جب کہ آپ کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ تمام انبیاء سے افضل ہیں، بعد میں بذریعہ وحی آپ ﷺ کو یہ بات بتادی گئی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے آپ ﷺ نے اس کا اظہار بھی فرمادیا۔ (مظہری)۔ حبیب فعیل بمعنی مفعول أي محبوب.

وَكُلُّ دَعْوَةِ نُبُوَّةٍ بعدَهُ فَغَيٌّ وهوى.
آپ ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعوی گمراہی اور خواہش پرستی ہے۔

الغيّ: ضد الرشاد- الهوى: عبارة عن شهوة النفس.

اس سے قبل آپ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا جب معلوم ہوا تو اب فرمایا کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی بھی کسی بھی قسم کی نبوت کا دعوی کرے گا تو وہ جھوٹا ہوگا، اس کا یہ دعوی خواہش پرستی کی علامت قرار دیا جائے گا، اس کی کوئی دلیل اور کوئی تاویل قبول نہ ہوگی اور نہ ہی اس سے دلیل طلب کی جائے گی جیسے مسیلمہ کذاب سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کوئی دلیل نہیں مانگی، بلکہ اس سے قتال کیا۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "إنه سيكون في أمتي كذابون ثلاثون كلهم يزعم أنه نبي وأنا خاتم النبيين لا نبي بعدي." (ابوداؤد: ۲۲۵۲)

یعنی میری امت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے، ہر ایک یہی کہے گا کہ میں نبی ہوں، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں۔ (میرے بعد کوئی کسی قسم کا نبی نہیں ہو سکتا)

یہاں اشکال ہو سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد سے آج تک بے شمار لوگ نبوت کا دعوی کر چکے، حالانکہ اس حدیث میں صرف تیس کے بارے میں پیشین گوئی کی گئی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں جن تیس دجالوں کا ذکر ہے وہ وہی ہیں جن کی شوکت قائم ہو جائے، متبع زیادہ ہوں اور ان کا مذہب چلے، بعض قریب میں اس کا مصداق

ونصاریٰ تک محدود نہیں۔ جیسے ارشاد ہے: ﴿قل یا ایھا الناس إنی رسول اللہ إلیکم جمیعاً﴾ (الاعراف:۱۵۸) اپنی خصوصیات میں ایک خصوصیت حضور ﷺ نے یہ بیان فرمائی ہے: ﴿وأرسلت إلی الخلق کافۃ وختم بی النبیون﴾ (الاعراف:۱۵۸)

قرآن مجید

وإنّ القرآن کلام اللّٰہ، منہ بدا بلا کیفیۃ قولاً، وأنزلہ علی نبیہ وحیاً، وصدّقہ المؤمنون علی ذلک حقاً، وایقنوا انہ کلام اللّٰہ تعالیٰ بالحقیقۃ لیس بمخلوق ککلام البریۃ

بے شک قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس کی ذات سے باعتبار قول بغیر کسی کیفیت کے یہ کلام ظاہر ہوا، اور اس کو اپنے رسول کریم ﷺ پر وحی کی صورت میں اتارا، اہل ایمان نے حق سمجھتے ہوئے اس کی تصدیق کی اور انہوں نے اس بات کا یقین کیا کہ حقیقۃً یہ اللہ کا کلام ہے مخلوق کے کلام کی طرح مخلوق نہیں۔

وإنّ القرآن: یہ عبارت "إنّ اللّٰہ تعالیٰ واحد" پر عطف ہو کر "نقول" کا مقولہ ہے۔ ای ونقول إنّ القرآن ... منہ بدا: ای لا من بعض المخلوقات۔ اس کی ذات سے کلام کی ابتداء ہوئی، ای ھو المتکلم بہ۔ اس سے مقصود معتزلہ وغیرہ کی تردید ہے جن کا خیال یہ ہے کہ کلام اللہ، اللہ کی ذات سے ظاہر نہیں ہوا، بلکہ یہ اللہ کی مخلوق اور اللہ کی ذات سے الگ ہے، ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے کلام کی تخلیق ایک محل میں کی، اس کے بعد اس محل سے کلام کا ظہور ہوا، ان سے یہ بھی منقول ہے کہ قرآن بطریق تخلیق حضرت جبرئیل علیہ السلام کے قلب پر وارد ہوا، پھر انہوں نے اس کو اپنی زبان سے تعبیر کیا۔ قولاً: کہہ کر اس سے معتزلہ کے خیال کی تردید کر دی گئی۔ بلا کیفیۃ: جار مجرور "قولاً" سے حال واقع ہے۔ ای مقولاً بلا کیفیۃ، یعنی حرف، آواز اور ظہور کی کیفیت کے بغیر یہ کلام (قرآن مجید) اللہ کی ذات سے باعتبار قول ظاہر ہوا۔

وحیاً: ای بواسطۃ الوحی۔ علی ذلک: الاشارۃ إلی ما ذکرہ من التکلم بہ علی الوجہ المذکور وإنزالہ۔ أنّہ: أی القرآن والمراد بہ المقروء

تمام اہل سنت (مذاہب اربعہ وغیرہ سلف وخلف) اس پر متفق ہیں کہ قرآن کریم

اللہ کا کلام اور غیر مخلوق ہے۔

> فمن سمعه فزعم أنه كلام البشر فقد كفر، وقد ذمه الله، وعابه، وأوعده بسقر حيث قال تعالى: ﴿سأصليه سقر﴾ (المدثر ۲۶)
>
> فلما أوعد الله بسقر لمن قال: ﴿إن هذا إلا قول البشر﴾ (المدثر ۲۵)
>
> علمنا وأيقنا أنه قول خالق البشر ولا يشبه قول البشر
>
> جس نے اس کو سن کر یہ گمان کیا کہ یہ انسان کا کلام ہے تو اس نے کفر کیا، بیشک اللہ تعالیٰ نے ایسے انسان کی مذمت بیان فرمائی اور اس کا عیب بیان کیا اور اسے جہنم کی دھمکی دی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "میں عنقریب جہنم میں داخل کروں گا" تو جب اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو جہنم کی وعید سنائی ہے جس نے یہ کہا: "یہ قرآن تو ایک انسان کا کلام ہے" تو ہم نے اس حقیقت کو جان لیا اور یقین کر لیا کہ یہ کائنات کے پیدا کرنے والے "رب العالمین" کا کلام ہے اور یہ انسان کے کلام جیسا نہیں۔

جس نے قرآن کے کلام اللہ ہونے سے انکار کیا بلاشبہ وہ کافر ہے، کیونکہ قرآن اللہ کا کلام اور اس کی صفت قدیم ہے اور جس نے اللہ کی صفت قدیم کی نسبت مخلوق کی طرف کر دی تو وہ منکر کی اور کافر ہے۔

ولا یشبه قول البشر: یعنی قرآن کلام اللہ، جو اللہ کی صفت ہے، یہ بشر کے قول سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا، کیونکہ قرآن اشرف، افصح اور اصدق ہے، قرآن جیسا کلام پیش کرنا انسانی طاقت اور بساط سے باہر ہے۔

صفات باری تعالیٰ

> ومن وصف الله بمعنى من معاني البشر، فقد كفر، فمن أبصر هذا اعتبر، وعن مثل قول الكفار انزجر، وعلم أن الله بصفاته ليس كالبشر
>
> جو اللہ تعالیٰ کے لئے انسانی صفات میں سے کوئی صفت ثابت کرے تو بلاشبہ اس نے کفر کیا، البتہ جس نے اس کو بصیرت کی نگاہ سے دیکھا تو اسے نصیحت حاصل ہوئی اور کفار کے قول کی مشابہت سے رک گیا اور اسے اس بات کا علم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں بشر کی طرح نہیں۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ دیکھیں گے لیکن مرئی (اللہ تعالیٰ) کے تمام حدود و اطراف کا احاطہ نہیں کر سکیں گے، اس طرح یہ رویت بغیر جہت اور کیفیت کی ہوگی۔

جہمیہ، معتزلہ، خوارج اور امامیہ رویت باری تعالیٰ کے منکر اور مخالف ہیں، جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور دین کے تمام بڑے مقتدا (اہل سنت والجماعت) رویت باری تعالیٰ کو برحق سمجھتے ہیں، قرآن کریم اور احادیث متواترہ سے یقینی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ آخرت میں دیدار الٰہی کا شرف حاصل ہوگا۔ (دنیا میں رویت الٰہی نہیں: کیونکہ دنیا کی انسانی آنکھوں میں وہ طاقت نہیں جو اللہ کا دیدار کر سکے؛ لیکن یہاں یہ بات واضح رہے کہ دنیا میں رویت الٰہی محال عادی شرعی ہے، محال عقلی نہیں، کیونکہ محال عقلی کا وجود کسی جگہ نہیں ہوتا، حالانکہ حق تعالیٰ کا دیدار آخرت میں ہوگا، اور دنیا میں بھی ہے! تو عدم رویت، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں، بلکہ ہماری طرف سے ہے ہم اس کے متحمل نہیں ورنہ حق تعالیٰ میں حجاب نہیں، وہ تو یہاں بھی ظاہر ہے اگر آفتاب چمک رہا ہے اور کوئی شخص آنکھ پر ہاتھ رکھ کر دیکھے تو مانع اس شخص کی طرف سے ہوگا آفتاب کو حجاب نہ کہا جائے گا۔

نوٹ: فرشتوں سے بھی اللہ تعالیٰ کا کلام بلاواسطہ نہیں ہوتا، جیسا کہ ترمذی کی روایت میں جبریل علیہ السلام سے منقول ہے کہ میں بہت قریب ہو گیا تھا اور پھر بھی ستر ہزار حجاب رہ گئے تھے۔ (معارف القرآن: ۷: ۱۹۰ الف)

شب معراج میں اللہ کے رسول نے اللہ کو دیکھا ہے یا نہیں، اس میں چونکہ صحابہ و تابعین کا اختلاف ہے، اس لئے علماء میں بھی اختلاف ہے، جو علماء رویت کے قائل ہیں، انہوں نے حضور ﷺ کو اس قاعدہ سے کہ دنیا میں رویت محال عادی ہے، مستثنیٰ کیا ہے، کیونکہ دلیل سے آپ ﷺ کا دیکھنا ثابت ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں استحالہ رویت کی علت رائی کی عدم قابلیت تھی، ورنہ مرئی میں تو کوئی مانع ہی نہیں۔ دیگر علماء عدم رویت کے قائل ہیں اور عدم رویت راجح ہے۔ (دنیا میں انسان کی قوت بینائی کا ضعف ہی انسان کے لئے ذات حق کے درمیان حجاب ہوتا ہے، اس لئے جنت میں جب انسان کی بینائی قوی کر دی جائے گی تو وہاں ہر جنتی حق تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہوگا، اس سلسلے میں امام طحاوی رحمہ

اللہ علیہ نے قرآن کریم کی آیت کریمہ ﴿وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ﴾ (القیامۃ: ۲۲، ۲۳) بطور دلیل پیش کی ہے، یعنی مؤمنین کے چہرے اس روز تر و تازہ اور ہشاش بشاش ہوں گے اور ان کی آنکھیں محبوب حقیقی کے دیدار مبارک سے روشن ہوں گی۔

لفظ "نظر" جب "الی" کے ساتھ متعدی ہو تو اس کے معنی ہیں "المعاینۃ بالابصار" آیت میں حرف "الی" صلہ ہے "ناظرۃ" کا، اس لئے رؤیت کے معنی میں ہوگا۔ نیز "نظر" کی نسبت چونکہ وجہ (محل بصر) کی طرف کی گئی ہے اس لئے بھی اس سے "نظر العین" مراد ہے۔

رؤیت باری تعالیٰ کی دوسری دلیل: قرآن کی آیت: ﴿لھم ما یشاؤن فیھا ولدینا مزید﴾ (ق: ۳۵) ہے یعنی جو چاہیں گے وہ ملے گا اور ہمارے پاس ہے کچھ زیادہ بھی۔ قال الطبری: قال علی بن ابی طالب وانس بن مالک رضی اللہ عنہما: "ھو النظر الی وجہ اللہ عز وجل" ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ ﴿للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ﴾ (یونس: ۲۶)

بھلے کام کرنے والوں کو وہاں بھلی جگہ ملے گی (یعنی جنت) اور اس سے زیادہ بھی کچھ ملے گا، "زیادۃ" کی تفسیر "دیدار مبارک" سے کئی احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہے، اور بہت سے صحابہ و تابعین سے منقول ہے۔ (فوائد عثمانیہ: ۲۷۶)

اور سنت میں دلیل وہ حدیث مشہور ہے، جس کو کئی اکابر صحابہ نے روایت کیا ہے، الفاظ حدیث یہ ہیں۔ "إنکم سترون ربکم کما ترون القمر لیلۃ البدر": (تم اپنے پروردگار کو اس طرح دیکھو گے، جس طرح چودھویں شب میں چاند کو دیکھتے ہو) یہاں "تشبیہ الرؤیۃ بالرؤیۃ" مراد ہے۔ "تشبیہ المرئی بالمرئی" مراد نہیں تاکہ اللہ کے لئے تشبیہ ثابت نہ ہو۔

قرآن وحدیث کے علاوہ رؤیت پر اجماع امت بھی ہے۔

تفسیرہ علی ما أراد ... درحقیقت معتزلہ نے رؤیت کے بارے میں وارد ہونے والے نصوص قرآن واحادیث میں تحریف سے کام لیا ہے۔ مثلاً امام طحاوی رحمۃ اللہ

علیہ کی پیش کردہ آیت کے بارے میں مخالفین کا کہنا ہے کہ "الی" حرف نہیں ہے، بلکہ اسم ہے اور "آلاء" کا مفرد ہے، جس کے معنی نعمت کے ہیں اور "ناظرۃ" بمعنی "منتظرۃ" کے ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان جنت میں اپنے پروردگار کی نعمتوں کا انتظار کریں گے، حالانکہ یہ تاویل قیاس سے بعید اور سیاق کے مخالف ہے، کیونکہ انتظار تو "اشد من الموت" کہا گیا ہے، جبکہ آیت کا مقصود یہاں اہل ایمان کے لئے خوشی کا بیان ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اس آیت کریمہ کی وہ تفسیر درست ہوگی، جو اللہ کی مراد اور علم کے مطابق ہو، صرف یہی بات "وكل ما جاء في ذلك من الحديث الصحيح عن رسول الله ﷺ" حدیث صحیح جو بھی اس سلسلے میں وارد ہو۔ وعن أصحابه: أي كذلك ما ورد عن أصحابه. فهو: حق ثابت. كما قال: أي كما قال قائله ولكن على المعنى الذي أراده الله. ومعناه: أي وتفسيره. على ما أراد: أي مراد الله تعالى.

ولا متوهمين: أي ظانين. بأهوائنا: جمع هوى أي هوى النفس. إلا من سلم لله تعالى ولرسوله ﷺ. جميع ما صح عنهما من محكم ومتشابه فأخذ بالمحكم على أحكامه. ورد: أي أسند. علم ما اشتبه عليه: علمه. إلى عالمه: أي على مراده. قرآن کریم کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے "لما عرفتم منه فاعملوا به، وما جهلتم منه فردوه إلى عالمه" (بخاری، فی افعال العباد) صاحب شرح المقاصد لکھتے ہیں: "ذهب أهل السنة إلى أن الله تعالى يجوز أن يرى وأن المؤمنين في الجنة يرونه منزها عن المقابلة والجهة والمكان." (شرح المقاصد ۴/۲۳۳)

> ولا يثبت قدم الإسلام إلا على ظهر التسليم والاستسلام.
>
> اسلام کا قدم صرف تسلیم و رضا پر ہی جم سکتا ہے۔

ولا يثبت قدم الإسلام: هذا من باب الاستعارة، إذ القدم الحسي لا تثبت إلا على ظهر شيء. التسليم: بذل الرضا بالحكم. الاستسلام: أي الانقياد ومنه التسليم فيما خفي المراد منه. یعنی جو قرآن وحدیث کے نصوص کے سامنے سر تسلیم خم نہیں ہوتا تو اس کا اسلام مضبوط نہیں رہتا، اسلام کے برقرار رہنے کے لئے

نصوص قرآن و نصوص احادیث کے سامنے تسلیم و انقیاد ضروری ہے۔

روى البخاري عن الإمام محمد بن شهاب الزهري رحمه الله أنه قال: "من الله الرسالة وعلى الرسول البلاغ وعلينا التسليم"

فمن رام علم ما حظر عن علمه، ولم يقنع بالتسليم فهمه، حجبه مرامه عن خالص التوحيد وصافي المعرفة وصحيح الإيمان، فيتذبذب بين الكفر والإيمان، والتصديق والتكذيب، والإقرار والإنكار، موسوسا تائها، زائغا شاكا، لا مؤمنا مصدقا، ولا جاحدا مكذبا.

لہٰذا جو شخص اس چیز کے جاننے کے درپے ہو جس سے اسے روکا گیا ہے اور اس کی سمجھ قناعت نہ کرے، تسلیم و رضا پر تو اسے اس کا قصد خالص توحید، دین کی سمجھ اور صحیح ایمان سے روک دے گا، پس وہ کفر و ایمان، تصدیق و تکذیب اور اقرار و انکار کے درمیان شک میں رہے گا اس کی حالت ہمیشہ شک کرنے والے اور وسوسہ میں مبتلا رہنے والے انسان کی سی ہوتی ہے جو نہ ایمان لا کر اقرار کر رہا ہوتا ہے نہ انکار۔

پچھلے متنوں میں جو مضمون ذکر ہوا ہے اس کی مزید تاکید ہے، حاصل یہ کہ علم کے بغیر امور دین میں گفتگو کرنا منع ہے۔

فمن رام: أي طلب. علم ما حظر عن علمه: أي منع علمه. حجبه: أي منعه. مرامه: أي مطلبه. عن خالص التوحيد ... من إضافة الصفة إلى الموصوف، في المواضع الثلاث أي التوحيد الخالص والمعرفة الصافية والإيمان الصحيح. فيتذبذب: أي يتردد.

موسوسا: اسم فاعل کا صیغہ ہے، وسوسہ والا ہونا۔ تائها: سرگشتہ و حیران (تیہ) سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ "لا مؤمنا مصدقا ولا جاحدا مكذبا" یہ "زائغا شاكا" کی تفسیر ہے۔

ولا يصح الإيمان بالرؤية لأهل دار السلام لمن اعتبرها منهم بوهم أو تأولها بفهم، إذ كان تأويل الرؤية وتأويل كل معنى يضاف إلى الربوبية لا يصح، فلا يصح الإيمان بالرؤية إلا بترك التأويل ولزوم التسليم، وعليه دين المرسلين ومن لم يتوق النفي والتشبيه زل ولم يصب التنزيه

اور اہل جنت کی رویت باری تعالیٰ (اللہ کے دیدار) پر ایمان صحیح نہ ہوگا اس شخص کا، جس نے رؤیت کو وہم سے اعتبار کیا یا فہم سے اس کی تاویل کی جبکہ رؤیت کی تاویل کرنا ایسے معنی پر اس صفت کی تاویل جس کی نسبت ربوبیت کی طرف ہو، درست نہیں، چنانچہ رؤیت پر ایمان تاویل کو چھوڑنے اور تسلیم ورضا کو لازم پکڑنے کے ساتھ ہی درست ہوگا اور اسی پر انبیاء علیہم السلام کا دین ہے، جو شخص نفی اور تشبیہ سے نہیں بچا، پھسل گیا اور تنزیہ (اللہ تعالیٰ کو صفت نقائص سے پاک سمجھنے) تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ منکرین رؤیت (معتزلہ) اور ان لوگوں کی تردید کر رہے ہیں، جو رؤیت باری تعالیٰ کے مسئلہ میں تاویل سے کام لے رہے ہیں، جو اس میں تاویل کرے گا اس کی دو صورتیں ہیں یا تو رؤیت کو مانے گا مگر اس رؤیت کو تشبیہ دے گا مخلوق کی رؤیت کے ساتھ۔ یا رؤیت کا بالکلیہ انکار کرے گا اور دونوں طریقے باطل ہیں، کیونکہ اول میں تشبیہ ہے اور ثانی میں تعطیل ہے۔

لأهل دار السلام: أي لأهل الجنة. بوهم: توهمه. جس میں اس نے اپنے وہم کا اعتبار کیا ہو مثلاً یوں سوچا کہ اللہ اصلاً دکھائی نہیں دیتے ہیں اور اگر نظر آئے بھی تو وہ کسی خاص شکل وصورت میں ہوں گے، حالانکہ اس وہم کو دفع کرنا اس پر لازم تھا۔

أو تأولها بفهم: أي الذي أنه فهم لها تأويلا يخالف ظاهرها. وتأويل كل معنى: أي بل تأويل كل معنى ترک تاویل سے ترک تاویل فاسد مراد ہے، کیونکہ وہ تحریف کے درجے میں ہے ورنہ تاویل کی ایک قسم تاویل صحیح بھی ہے جو مفسرین کے ہاں معتبر ہے۔ وعليه: أي على ذلك المذكور. ومن لم يتوق: یعنی جس نے اللہ کی صفات کی نفی سے احتراز نہیں کیا، بلکہ اللہ کی صفات کی نفی کی، جیسا کہ معطلہ کا مسلک

ہے۔ والتشبیہ: أي ومن لم یتوق التشبیہ. جو اللہ کی صفات کی تشبیہ سے محفوظ نہ رہا، بلکہ اللہ کی صفات کو مخلوق کی صفات سے تشبیہ دیتا ہے، جیسا کہ مجسمہ کا خیال ہے۔ زل: أي عن مایتممہ وضل. ولم یصب التنزیہ: أي وما قد یزعمہ منہ وقع فیہ.

معتزلہ کا خیال ہے کہ ہم رویت کی نفی کر کے اللہ کی تنزیہ کرتے ہیں، حالانکہ صفت کمال کی نفی سے تنزیہ کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس لئے کہ جب اہل ایمان اللہ کو دیکھیں گے مگر اللہ تعالیٰ کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکیں گے، تو مرئی ہونے کے باوجود محاط نہ ہونا صفت کمال ہے، رویت کی نفی صفت کمال نہیں "إذ المعدوم لا یری" نہ دکھائی دینا تو معدوم کی صفت ہے۔

> فإن ربنا جل وعلا موصوف بصفات الوحدانیۃ، منعوت بنعوت الفردانیۃ، لیس في معناہ أحد من البریۃ.
>
> کیونکہ ہمارا پروردگار جل وعلا صفات وحدانیت کے ساتھ متصف ہے اور صفات فردانیت کے ساتھ منعوت ہے، مخلوق میں سے کوئی اس کا ہم وصف نہیں ہے۔

یہ عبارت ماقبل میں اثبات الصفات اور نفی التشبیہ کی تاکید ہے، یعنی اللہ کی رویت تو ہوگی، مگر مخلوق کی طرح نہیں، کیونکہ اللہ کی ذات کی طرح ان کی صفات بھی یکتا ہیں۔ وصف اور نعت مترادف ہیں، وحدانیت اور فردانیت بھی مترادف ہیں، البتہ بعض نے ان دونوں میں فرق کیا ہے، یعنی وحدانیت ذات کے ساتھ خاص ہے، جبکہ فردانیت صفات کے ساتھ خاص ہے،" فھو تعالیٰ متوحد في ذاتہ منفرد بصفاتہ"

جل: أي عظم. علا: أي ارتفع عما لا یلیق بہ.

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے جملے سے ﴿اللّٰہ احد﴾ دوسرے جملے سے ﴿اللّٰہ الصمد لم یلد ولم یولد﴾ اور تیسرے جملے سے ﴿ولم یکن لہ کفوا احد﴾ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان الفاظ کے معنی کیا ہیں؟ اس سلسلے میں ایک مذہب تو متکلمین اور متأخرین کا ہے، انہوں نے متشابہات کی مناسب تاویلات کیں، اس لئے ان کو "مؤولہ" کہتے ہیں، دوسرا مذہب متقدمین اور محدثین کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ متشابہات کے معنی مراد اور ان کی کیفیت کے بارے میں توقف وسکوت کیا جائے گا، ان حضرات کو "مفوضہ" کہتے ہیں۔ جمہور محدثین میں علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی شامل ہیں، البتہ جمہور اور علامہ کے مذہب میں ایک باریک فرق ہے، چنانچہ جمہور محدثین ان الفاظ کی تشریح ہی سے توقف کرتے ہیں نہ یہ کہتے ہیں کہ اس کے حقیقی معنی مراد ہیں اور نہ یہ کہتے ہیں کہ مجازی معنی مراد ہے، جبکہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان الفاظ کو حقیقی معنی پر محمول کرکے اس کی کیفیت سے توقف کرتے ہیں، علامہ ان الفاظ کی تشریح سے توقف نہیں کرتے، جبکہ جمہور الفاظ متشابہہ کی تشریح ہی سے توقف کرتے ہیں۔ البتہ یہ فرق (معاذ اللہ) تشبیہ اور تنزیہ کا فرق نہیں، بلکہ تعبیر کی تعبیر کا فرق ہے، لہٰذا اس مسئلے میں علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو جمہور اہل سنت سے مختلف قرار دے کر نشانہ ملامت بنانا درست نہیں، ہاں اس قسم کے مسائل میں سلامتی کا راستہ جمہور ہی کا ہے جو ان الفاظ کی تشریح ہی سے توقف کرتے ہیں۔

(ملخص از درس ترمذی، افادات حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی: ۲/ ۲۰۴)

واضح رہے کہ دونوں مذہبوں میں تفویض اولیٰ ہے، لیکن جس شخص سے خطرہ ہو کہ اگر اس کے سامنے تاویل نہ کی گئی تو وہ کسی شک میں یا کسی بد اعتقادی میں واقع ہو جائے گا، اس کے لئے ایسی تاویل جو لغۃً واستعمالاً بے تکلف ہو، اختیار کرنے کی گنجائش ہے، چنانچہ متشابہات کی مناسب تاویلات، کتب تفاسیر وشروح احادیث میں موجود ہیں، لیکن یہ یاد رکھیے کہ تاویل کا منشا صرف اسی قدر ہے کہ جب مجسمہ نے اس قسم کی آیات واحادیث سے اللہ تعالیٰ کی جسمیت کا خیال کیا تو علماء متأخرین نے ان کے الزام وتسکات کے واسطے تاویل کرنا شروع کیا، نہ اس غرض سے کہ یہ معانی مؤولہ مراد ہیں، بلکہ اس غرض سے کہ جسمیت کا شبہ دفع ہو جائے۔ اس لئے لا مذہب (غیر مقلدین) کا مؤولہ کو منکرین صفات کے زمرے میں شامل کرکے ان کو مورد الزام ٹھہرانا نہایت غلو ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

معراج

والمعراج حق، وقد أسري بالنبي ﷺ وعرج بشخصه في اليقظة إلى السماء، ثم إلى حيث شاء الله من العلى، وأكرمه الله بما شاء، وأوحى إليه ما أوحى ما كذب الفؤاد ما رأى، فصلى الله عليه وسلم في الآخرة والأولى

معراج برحق ہے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو رات کے وقت سیر کرائی اور بیداری کی حالت میں آپ ﷺ کی ذات اقدس کو آسمان کی طرف اٹھایا گیا، پھر بلندیوں پر اللہ تعالیٰ نے جہاں تک چاہا لے گیا اور اپنی چاہت کے مطابق آپ کو عزت بخشی، جو چاہی فرمائی اپنے بندے کی طرف وحی، دل نے جھٹلایا نہیں جو کچھ دیکھا، دنیا و آخرت میں آپ ﷺ پر درود و سلام ہو۔

والمعراج: أي نقول المعراج حق. المعراج: مفعال من العروج، أي الآلة التي يعرج فيها، أي يصعد، وهو بمنزلة السلم، لكن لا نعلم كيف هو؟ وحكمه كحكم غيره من المغيبات نؤمن به ولا نشتغل بكيفيته

علماء کی اصطلاح میں مکہ سے ام ہانی کے گھر سے بیت المقدس تک کے سفر کو "اسراء" اور وہاں سے اوپر "سدرۃ المنتہیٰ" تک کی سیاحت کو "معراج" کہتے ہیں اور بسا اوقات دونوں سفروں کے مجموعہ کو ایک ہی لفظ "اسراء" یا "معراج" سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا زمینی سفر جو "اسراء" کہلاتا ہے قطعی ہے، کتاب اللہ کی آیت ﴿سبحان الذي أسرى بعبده ليلا من المسجد الحرام إلى المسجد الأقصى﴾ سے ثابت ہے اور پھر مسجد اقصیٰ سے آسمانوں کی طرف عروج جو معراج کہلاتا ہے اس کا ذکر سورۃ نجم کی آیات میں اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے اور آسمانوں سے اوپر عرش تک یا جنت تک یا اس کے علاوہ جن مقامات تک اللہ نے لے جانا چاہا اخبار آحاد سے ثابت ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: وحديث الإسراء

أجمع علیه المسلمون و أعرض عنه الزنادقة و الملحدون" (ابن کثیر)

مذہب راجح یہی ہے کہ معراج و اسراء کا واقعہ حالت بیداری میں بجسدہ الشریف واقع ہوا جس کو عروج صوری اور عروج آسمانی کہتے ہیں۔ سلف میں سے یہ کسی کا قول نہیں کہ معراج حالت بیداری میں محض روحانی طور پر ہوئی ہو۔ یا منامی طور پر یا کشفی طور پر۔ بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایت اس واقعہ معراج میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت (واللہ ما فقد جسد محمد ﷺ فی لیلة الإسراء) سے مقدم ہے۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں فقدان کے معنی طلب کے ہیں۔ (گم ہو جانے والا معنی یہاں مراد نہیں) اب عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا مطلب صاف ہے کہ آپ ﷺ اتنی دیر تک گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ ﷺ کی طلب اور تلاش کی جاتی۔ یعنی آپ ﷺ گھر سے جدا تو ہوئے مگر زیادہ دیر نہیں گزری جس سے گھر والوں کو پریشانی ہوتی ہو اور تلاش کی نوبت آتی ہو اس طرح تطبیق ہو جاتی ہے۔ باقی طلب اور تلاش کے معنی میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے۔ "قالوا و أقبلوا علیهم ماذا تفقدون"۔

عروج مشخصہ سے اشارہ ہے کہ معراج روح کی نہیں تھی۔ فی الیقظة سے اشارہ ہے کہ معراج عالم خواب میں نہ تھی۔

مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک یہ سفر براق پر ہوا۔ جب دروازہ بیت المقدس پر پہنچے تو براق کو دروازہ کے قریب باندھ دیا اور آپ مسجد بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اس کے قبلہ کی طرف تحیة المسجد کی دو رکعتیں ادا فرمائیں اس کے بعد ایک زینہ لایا گیا، اس زینہ کے ذریعے آپ پہلے آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد باقی آسمانوں پر تشریف لے گئے، ہر آسمان میں وہاں کے فرشتوں نے آپ کا استقبال کیا اور ہر آسمان میں ان انبیاء علیہم السلام سے ملاقات ہوئی، جن کا مقام کسی معین آسمان میں ہے، چنانچہ آسمان اول پر آدم علیہ السلام سے اور دوسرے آسمان پر یحیی علیہ السلام اور عیسی علیہ السلام سے اور تیسرے پر یوسف علیہ السلام سے اور چوتھے پر ادریس علیہ السلام سے اور پانچویں پر ہارون علیہ السلام سے اور چھٹے پر موسی علیہ السلام سے اور ساتویں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔

معراج کی احادیث تقریباً تیس صحابہ سے منقول ہیں جن میں معراج واسراء کے واقعات بسط وتفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

وأوحى إليه ما أوحى : یعنی جبرئیل جب حضور ﷺ کے نزدیک ہو گئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندہ محمد ﷺ پر وحی بھیجی، غالباً اس سے مراد سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات ہیں اور کچھ احکام ہوں گے۔ (فوائد عثمانیہ)

ما كذب الفؤاد ما رأى : یعنی جبرئیل کو آپ نے آنکھ سے دیکھا اور اندر سے دل نے کہا کہ اس وقت آنکھ ٹھیک ٹھیک جبرئیل کو دیکھ رہی ہے، کوئی غلطی نہیں کر رہی کہ کچھ کا کچھ نظر آتا ہو۔ (فوائد عثمانیہ)

نوٹ:۔ آسمان سے نبی اکرم ﷺ کا آگے جانا کہاں تک ہے؟ اس میں اختلاف ہے اس وجہ سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا تعین نہیں فرمایا۔

حوض کوثر

> والحوض الذي أكرمه الله تعالى به غياثاً لأمته حق.
>
> حوض کوثر جس کے ذریعے خدا نے آپ کو عزت بخشی، آپ کی امت کی سیرابی کے لئے برحق ہے۔

میدان حشر میں ایک حوض ہوگا، جس میں جنت کی "کوثر" نامی نہر کا پانی دو آبخوروں یا نالوں کے ذریعہ ڈالا جائے گا چنانچہ اصل نہر کوثر جنت میں ہے، لیکن اس حوض کو بھی "کوثر" کہتے ہیں، حوض کوثر کے عجیب وغریب اوصاف احادیث متواترہ میں بیان ہوئے ہیں، شارح ابن ابی العز کے الفاظ میں ان اوصاف کا خلاصہ یہ ہے۔ "إنه حوض عظيم ومورد كريم، يمد من شراب الجنة، من نهر الكوثر الذي هو أشد بياضاً من اللبن وأبرد من الثلج، وأحلى من العسل، وأطيب ريحاً من المسك، وهو في غاية الاتساع، عرضه وطوله سواء، كل زاوية من زواياه مسيرة شهر."

اس کے علاوہ احادیث میں یہ بھی ہے کہ اس حوض پر جو آبخورے (پانی پینے

کے برتن) رکھے ہوں گے وہ آسمان کے ستاروں سے زیادہ تعداد میں ہوں گے اور ستاروں سے زیادہ چمکدار ہوں گے۔" من شرب منه شربة لا يظمأ ابدا۔" ایک مرتبہ جو حوض سے پی لے گا، پھر وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔ لوگ قبروں سے پیاسے اٹھیں گے، آنحضرت ﷺ اپنی امت کے پیاسوں کو اسی حوض کوثر سے پانی پلائیں گے اس لئے آپ کو "ساقی کوثر" کہا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "انا فرطكم على الحوض" میں حوض پر تمہارا پیشرو ہوں گا۔ یعنی سب سے پہلے میں پہنچوں گا۔ حوض ہر نبی کا ہوگا جو اپنی اپنی امت کو سیراب فرمائیں گے لیکن سب سے بڑا حوض محمد عربی ﷺ کا ہوگا اور یہاں آنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہوگی۔ (شرح عقیدة سفارینیہ تو نبرا س)

شفاعت

> والشفاعة التي ادخرها الله لهم كما روى في الأخبار.
>
> امت کے لئے رسول اللہ ﷺ کی وہ سفارش برحق ہے جس کو اللہ نے لوگوں کے لئے ذخیرہ بنا کر رکھا ہے جیسا کہ متعدد احادیث میں اس کا ذکر آتا ہے۔

والشفاعة: اي ونقول الشفاعة العظمى لرسول الله ﷺ يوم القيامة في كافة الخلق لاراحتهم من الموقف حق.

یوں تو شفاعت کا ثبوت انبیاء اور صلحاء سب کے لئے ہے، لیکن شفاعت عظمیٰ (جس کو شفاعت کبریٰ بھی کہتے ہیں) صرف ہمارے پیغمبر پاک ﷺ کی خصوصیت ہے، کسی اور نبی کو یہ خصوصیت نہیں دی گئی ہے۔ اس شفاعت عظمیٰ کی تفصیل اس حدیث میں ہے، جس میں فرمایا کہ: میدان حشر میں شدت گرمی سے سب لوگ تنگ آ کر آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، اور عیسیٰ علیہم السلام کے پاس شفاعت کے لئے یکے بعد دیگرے جائیں گے اور یہ سب معذرت پیش کریں گے اور بالآخر پیغمبر پاک ﷺ کے پاس آ کر شفاعت طلب کریں گے۔ اللہ کے رسول سجدہ میں گر کر اللہ کی خوب تعریف کریں گے اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے: "يا محمد! ارفع راسك، سل تعطه، اشفع تشفع" یعنی اے محمد! اپنے سر کو سجدہ سے اٹھائیے، مانگو تجھے دیا جائے گا، شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی، الغرض

خاتم الانبیاء ﷺ یہ شفاعت کبریٰ میدانِ محشر کی سختی میں تخفیف اور حساب و کتاب شروع کروانے کے لئے فرمائیں گے۔

اہل کبائر کے حق میں حضرات انبیاء اور صلحاء امت کی شفاعت یعنی گناہ معاف کیے جانے کی سفارش ہوگی۔ جسے اللہ تعالیٰ منظور بھی فرمائیں گے۔ اس سلسلے میں حضرت انس بن مالک ﷺ کی روایت سے حدیث ہے: "**شفاعتي لأهل الكبائر من أمتي**" (رواہ ابو داود) واضح رہے کہ شفاعت میں شرط یہ ہے کہ شفیع عند اللہ محبوب ہو، یعنی انبیاء اور صلحاء میں ہو اور مشفوع لہ شفاعت کا اہل ہو یعنی مؤمن و موحد ہو، کیونکہ کافر مشرک کی شفاعت نہیں ہوگی۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ شفاعت گناہ معاف کرانے اور گناہگاروں کو عذاب سے رہائی دلانے کے لئے نہیں ہوگی (جیسا کہ اہل سنت کہتے ہیں) بلکہ نیک بندوں کے ثواب میں زیادتی اور اضافہ کرنے کے لئے ہوگی، غرض یہ کہ اہل جنت کے لئے رفع درجات اور مراتب کی بلندی کے لئے نبی کریم ﷺ جو شفاعت فرمائیں گے، اہل سنت کی طرح معتزلہ بھی اس کے قائل ہیں، ایسے ہی معتزلہ شفاعت عظمیٰ کے بھی قائل ہیں، معلوم ہوا کہ وہ شفاعت کی ایک خاص قسم کے منکر ہیں۔

عہد میثاق

والميثاق الذي أخذه الله تعالى من آدم عليه السلام وذريته حق

سیدنا آدم ﷺ اور اولادِ آدم سے اللہ تعالیٰ نے جو میثاق (اقرار) لیا وہ بھی برحق ہے۔

اس میثاق سے مراد وہ میثاق ہے کہ جس کا ذکر سورۃ الاعراف میں ہے۔

ارشاد ہے: ﴿**وإذ أخذ ربك من بني آدم من ظهورهم ذريتهم وأشهدهم على أنفسهم ألست بربكم قالوا بلى شهدنا**﴾

جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر، کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟ بولے ہاں ہے، ہم اقرار کرتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب موضح القرآن میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کروایا اپنی خدائی کا، پھر پشت میں داخل کیا۔ اس سے مدعی یہ ہے کہ خدا کے رب مطلق ماننے میں ہر کوئی آپ کفایت کرتا ہے، باپ کی تقلید نہ چاہئے اگر باپ شرک کرے، بیٹے کو چاہئے ایمان لاوے اگر کسی کو شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا پھر کیا حاصل؟ تو یوں سمجھے کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں ہے اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ سب کا خالق اللہ ہے سارا جہاں قائل ہے اور جو کوئی منکر ہے یا شرک کرتا ہے سو اپنی عقل ناقص کے دخل سے پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے۔

> وقد علم الله تعالىٰ فيما لم يزل عدد من يدخل الجنة وعدد من يدخل النار جملة واحدة فلا يزاد في ذلك العدد ولا ينقص منه. وكذلك افعالهم فيما علم انهم يفعلونه.
>
> اللہ تعالیٰ کو ازل سے ان سب لوگوں کا مکمل علم ہے جو جنت میں جائیں گے اور جہنم میں جائیں گے، اس تعداد میں کسی قسم کا اضافہ ہوگا اور نہ کمی اسی طرح لوگوں کے وہ اعمال بھی اللہ کے علم میں ہے جو ان کو مستقبل میں سرانجام دینے ہیں۔

علم الله تعالیٰ: ای وبقول قد علم الله..... فيما: اي في علمه الأزلي الذي۔ لم يزل: علمه وكذلك افعالهم فيما: اي في الذي علم منهم انهم يفعلونه من خير وشر ونفع أو ضر.

غرضیکہ جتنے لوگ جنت میں داخل ہوں گے ان کی تعداد اور جو جہنم میں جائیں گے سب کی تعداد اللہ تعالیٰ کے علم میں ازل سے ہے۔

> وكلٌ ميسّرٌ لما خلق له والأعمال بالخواتيم، والسعيد من سعد بقضاء الله، والشقي من شقي بقضاء الله.
>
> ہر شخص کے لئے وہی کام آسان کیا جاتا ہے، جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے، سعادت مند وہ ہے جس کے لئے تقدیر میں سعادت لکھ دی گئی، بدبخت (بدنصیب) وہ ہے جس کی تقدیر میں بدبختی لکھ دی گئی ہو۔

"وكل ميسر..." یہ مضمون حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: "اعملوا فكل ميسر لما خلق له، أما أهل السعادة فييسرون لعمل أهل السعادة، وأما أهل الشقاوة فييسرون بعمل أهل الشقاوة"۔

تم عمل کرو، ہر شخص جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے، وہ اس کے لئے آسان کر دیا جاتا ہے، جو اہل سعادت سے ہوتا ہے اہل سعادت والے عمل کی توفیق دے دی جاتی ہے، اور جو اہل شقاوت سے ہوتا ہے اس کے لئے اہل شقاوت والے عمل آسان کر دیئے جاتے ہیں۔ (تفسیر بخاری سورة الليل)

﴿فأما من أعطى واتقى وصدق بالحسنى﴾ [الآية] کا یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ سعداء جب نیک عمل اختیار کرتے ہیں اور اشقیاء جب بدی کی طرف چلتے ہیں تو دونوں کے لئے وہی راستہ آسان کر دیا جاتا ہے جو انہوں نے تقدیر الٰہی کے موافق اپنے ارادہ واختیار سے پسند کر لیا ہے۔

"والأعمال بالخواتيم" أي والأعمال إنما تعتبر بالخواتيم۔ انسان کا دار ومدار خاتمہ پر ہے، مقاصد الحسنی میں اس کی تخریج کچھ اس طرح ہے: "والسعيد قد يشقى والشقي قد يسعد" یعنی زندگی بھر ایک آدمی اچھے اعمال کرتا ہے مگر زندگی کے آخری لمحات میں کچھ اس طرح عمل کر گزرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی سعادت شقاوت میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور کبھی اس کے برعکس زندگی بھر اعمال بد کرتے ہیں مگر بالآخر بھلائی کا کام کر گزرتا ہے جس کی وجہ سے نیک بخت ہو جاتا ہے۔ "والسعيد من سعد بقضاء الله تعالى والشقي من شقي بقضاء الله تعالى" سے اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ خواتیم کی بنا اللہ کے سابقہ قضاء پر ہے یعنی سعید اور شقی ابھی وجود میں نہیں آیا مگر اس کی سعادت اور شقاوت کا فیصلہ پہلے کیا جا چکا ہے، جس کے لئے فیصلہ سعادت ہے، وہ اللہ کا فضل ہے اور جس کے لئے فیصلہ شقاوت ہے، وہ اس کا عدل ہے۔ ہوگا تو وہی جو فیصلہ قدرت کا ہو چکا ہے، مگر اس کے باوجود انسان کا اختیار اور اس کی قدرت جس کی بنا پر وہ امور شرعیہ کا مکلف ہے، برقرار ہے۔

وأصل القدر سر الله في خلقه لم يطلع على ذلك ملك مقرب ولا نبي مرسل. والتعمق والنظر في ذلك ذريعة الخُذلان، وسلّم الحرمان، ودرجة الطغيان، فالحذر كل الحذر من ذلك، نظرا أو فكرا أو وسوسة، فإن الله تعالى طوى علم القدر عن أنامه ونهاهم عن مرامه كما قال تعالى في كتابه ﴿لا يسئل عما يفعل وهم يسئلون﴾ [الأنبياء: ٢٣] "فمن سأل لم فعل" فقد رد حكم الكتاب ومن رد حكم الكتاب، كان من الكافرين

تقدیر کی حقیقت یہ ہے کہ یہ مخلوق میں اللہ تعالیٰ کا ایک راز ہے جس کی اطلاع نہ تو مقرب فرشتے کو ہے نہ ہی کسی نبی مرسل کو۔ تقدیر میں غور و فکر ناکامی اور محرومی اور سرکشی کا ذریعہ ہے، مسئلہ تقدیر میں بحث سے مکمل اجتناب ضروری ہے، چاہے اس کا تعلق غور و فکر، وسوسے اور خیالات سے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تقدیر کا علم اپنی مخلوق سے سمیٹ لیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے پوچھا نہیں جائے گا اور جو کام یہ لوگ کرتے ہیں اس کے بارے میں ان سے پوچھ ہوگی"۔ جس نے یہ سوال اٹھایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام کیوں کیا؟ اس نے قرآن مجید کے حکم کو ٹھکرا دیا اور جس نے قرآن مجید کے حکم کو ٹھکرایا وہ زمرۂ کفار میں شامل ہو گیا۔

القدر: بتحريك الدال وتسكينها. سر الله: أي علمه بما يكون.

لم يطلع على ذلك: السر الذي أسره سبحانه وتعالى. حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی ارشاد ہے: "القدر سر الله فلا يكشفه". التعمق: هو المبالغة في الشيء.

الخذلان: بالضم، ترك العون والنصرة. سلم الحرمان: بكسر الحاء، یعنی یہاں پر اس تعمق سے محرومی کا ذریعہ ہے۔ الذريعة والوسيلة والدرجة والسلم متقارب المعنى، وكذلك الخُذلان والحرمان والطغيان متقارب المعنى أيضا، لكن الخذلان في مقابلة النصر، والحرمان في مقابلة الظفر،

والطغيان في مقابلة الاستقامة. فالحذر... : أي إذا كان الأمر كذلك: فاحذر حذرا كل الحذر. "فالحذر" کے اندر فاء فصیحیہ ہے اور یہ "احذر" فعل کا مفعول مطلق ہے اور "کل الحذر" اس کی تاکید ہے آگے "نظراً وفکراً ووسوسة" تمیز ہے۔

نوٹ: امام طحاوی نے مسئلہ تقدیر ایک جگہ بیان نہیں کیا بلکہ متفرق مقامات میں بیان کیا ہے۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ ہر چیز جو پیش آنے والی ہے اللہ کے علم میں پہلے سے مقرر ہو چکی ہے "وخالف في ذلك القدرية" قدریہ کا خیال ہے کہ جو چیز جو پیش آنے والی ہے وہ اللہ کے علم میں پہلے سے متعین نہیں ہو چکی ہے بلکہ ان چیزوں کے وقوع کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو جان لیتا ہے۔ الغرض قبل از وقوع حوادث ہر ایک چیز سے لاعلم رہنا، اور تعیین اللہ تعالیٰ کا علم محیط اور ازلی متعلق اور وابستہ ہے تو یہ کہ وقوع کے بعد اس سے اللہ تعالیٰ کا علم وابستہ ہوتا ہے جیسا کہ قدریہ کا خیال ہے۔ "وسميت هذه الفرقة القدرية لإنكارهم القدر.

ومن رد حكم كتاب الله ... : شکل اول سے قیاس اقترانی کی شکل بنتی ہے اس کی ترتیب یہ ہے "فمن سأل: لم فعل؟ فقد رد حكم كتاب الله صغرى، ومن رد حكم كتاب الله كان من الكافرين كبرى، اب نتیجہ ہوگا "من سأل: لم فعل؟ كان من الكافرين"

> فهذا جملة ما يحتاج إليه من هو منور قلبه من أولياء الله تعالى وهي درجة الراسخين في العلم، لأن العلم علمان: علم في الخلق موجود وعلم في الخلق مفقود، فإنكار العلم الموجود كفر، وادعاء العلم المفقود كفر، ولا يثبت الإيمان إلا بقبول العلم الموجود، وترك طلب العلم المفقود
>
> یہ وہ تمام باتیں ہیں جن کی ضرورت ہر اس شخص کو ہوتی ہے جن کے دل منور ہوں اللہ کے اولیاء میں سے، اور یہ مقام و مرتبہ راسخین فی العلم کا ہے

> ہوتا ہے، کیونکہ علم دو طرح کا ہے ایک علم مخلوق میں موجود ہے اور دوسرا علم مخلوق میں ناپید ہے، موجود علم کا انکار اور مفقود علم کا دعویٰ کفر ہے، علم موجود کے قبول کرنے اور علم مفقود کے ترک کرنے سے ایمان میں مضبوطی نصیب ہوتی ہے۔

یعنی دونوں چیزیں جن پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے ایمان کی پختگی کی علامت ہیں، اسی لئے وہ اولیاء اللہ جن کے قلوب منور ہوتے ہیں وہ بھی ان دونوں کی جانب محتاج ہیں۔ "علم موجود" سے مراد ہے علم الشریعۃ (چاہے اصول ہو یا فروع) اور "علم مفقود" سے مراد تقدیر کا علم ہے۔ حاصل یہ ہے کہ موجود علم کا انکار کفر ہے، "فمن انكر شيئا مما جاء به الرسول كان من الكافرين" اور مفقود علم کا دعویٰ کفر ہے، "فمن ادعى علم الغيب كان من الكافرين" جو لوگ غیر اللہ کو عالم الغیب کہتے ہیں، ان مضامین میں ان کو گہرائی کے ساتھ غور کر لینا چاہئے۔

لوح و قلم

> ونؤمن باللوح والقلم، وبجميع ما فيه قد رقم
>
> ہم لوح، قلم اور ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں جو تقدیر میں لکھ دی گئی ہیں۔

"لوح" سے لوح محفوظ مراد ہے، جس کی تعریف علامہ عبدالغنی میدانی (شارح کتاب ہٰذا) کے الفاظ میں یہ ہے: "وهو جسم عظيم نوراني كتب فيه القلم بإذن الله تعالى ما هو كائن إلى يوم القيامة"۔ "قلم" سے مراد وہ خاص قلم ہے جس کا ذکر حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ "أول ما خلق الله تعالى القلم، فقال له: أكتب، فقال: يا رب، وما أكتب؟ قال: أكتب مقادير كل شيء حتى تقوم الساعة" یہ قلم کی قسم اٹھائی گئی قرآن کریم میں کہا گیا ہے ﴿ن والقلم وما يسطرون﴾ [القلم: ١] (اخرجه ابوداود والترمذي في ابواب القدر)

وبجميع ما فيه: أي ونؤمن بجميع ما فيه.

فلو اجتمع الخلق كلهم على شيء كتبه الله تعالى أنه كائن، ليجعلوه غير كائن، لم يقدروا عليه، ولو اجتمعوا كلهم على شيء لم يكتبه الله تعالى فيه ليجعلوه كائنًا، لم يقدروا عليه، جفّ القلم بما هو كائن إلى يوم القيامة وما أخطأ العبد لم يكن ليصيبه وما أصابه لم يكن ليخطئه.

پس اگر جمع ہو جائے پوری مخلوق کسی ایک شی پر جس کو اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ یہ ہوگی تاکہ وہ مخلوق اس کو نہ ہونے والی بنا دے تو وہ اس پر قادر نہ ہوں گے اور اگر ساری مخلوق کسی ایک چیز پر جمع ہو جائے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس میں نہیں لکھا تاکہ وہ مخلوق اس کو ہونے والی بنا دے تو وہ اس پر قادر نہیں ہوں گے، اور جو چیز بندہ سے چوک گئی (یعنی اس تک نہیں پہنچی) وہ اس کو پہنچ نہیں سکتی تھی اور جو چیز اس کو پہنچی ہے وہ اس سے چوک نہیں سکتی تھی۔

اسی طرح کا مضمون حدیث میں ہے "عن ابن عباس رضي الله عنهما قال: كنت خلف النبي ﷺ يومًا، فقال: "يا غلام! إني أعلمك كلمات: احفظ الله يحفظك. (تم اللہ کو یاد رکھو، اللہ تم کو یاد رکھیں گے۔) احفظ الله تجده تجاهك. (تم اللہ کو یاد رکھو گے تو اس کو ہر حال میں اپنے سامنے پاؤ گے۔) إذا سألت فاسأل الله، وإذا استعنت فاستعن بالله، واعلم أن الأمة لو اجتمعت على أن ينفعوك بشيء، لم ينفعوك إلا بشيء قد كتبه الله عليك، رُفعت الأقلام، وجفّت الصُّحف. (أخرجه الترمذي في صفة القيامة)

امام طحاویؒ کے قول کے "وما أخطأ العبد ..." کا مضمون دوسری روایت میں ہے "واعلم أنّ ما أخطأك لم يكن ليصيبك، وما أصابك لم يكن ليخطئك." (مسند احمد)

وَعَلَى الْعَبْدِ أَنْ يَعْلَمَ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ سَبَقَ عِلْمُهُ فِي كُلِّ كَائِنٍ مِنْ خَلْقِهِ فَقَدَّرَ ذٰلِكَ تَقْدِيرًا مُحْكَمًا مُبْرَمًا، لَيْسَ فِيهِ نَاقِضٌ، وَلَا مُعَقِّبٌ، وَلَا مُزِيلٌ، وَلَا مُغَيِّرٌ، وَلَا مُحَوِّلٌ، وَلَا نَاقِصٌ، وَلَا زَائِدٌ مِنْ خَلْقِهِ فِي سَمَاوَاتِهِ وَأَرْضِهِ

بندہ پر واجب ہے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا علم اس کی مخلوق میں سے ہر ہونے والی چیز سے مقدم ہو چکا ہے، اور اسے مضبوط اور نہ ٹلنے والی تقدیر سے مقدر کیا ہے، اس تقدیر کو آسمان اور زمین کی مخلوقات میں سے نہ کوئی توڑنے والا ہے اور نہ ہی کوئی ملتوی کرنے والا ہے اور نہ کوئی زائل کرنے والا ہے اور نہ کوئی اسے بدلنے والا ہے اور نہ کوئی اضافہ کرنے والا اور نہ کوئی گھٹانے والا ہے۔

حدیث: "قدر الله مقادير الخلق قبل أن يخلق السموات والأرض بخمسين ألف سنة وعرشه على الماء." کی روشنی میں یہ بات طے ہے، کہ جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے وہ پہلے سے اللہ تعالیٰ نے مقدر کر رکھا ہے، یہاں اب فرماتے ہیں کہ: جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے وہ پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی ہے، اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ اشیاء اپنے مخصوص اوقات میں موجود ہوں گی اور ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔ "فيثبت علمه القديم وفي ذلك الرد على من ينكر علمه القديم."

غالی قسم کے معتزلہ اس بات سے (کہ اللہ ازل ہی سے عالم تھا) انکار کرتے ہیں۔
وقالوا: إن الله تعالى لا يعلم أفعال العباد حتى يفعلوا، تعالى الله عما يقولون علوًا كبيرًا.

نوٹ: تقدیر دو قسم پر ہیں۔ ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی، جو تقدیر بدلتی ہے، اس کو معلق اور جو نہیں بدلتی اس کو مبرم کہتے ہیں، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عمر یا رزق وغیرہ کسی کے تقدیر میں لکھ دیے ہیں، وہ بعض اعمال کی وجہ سے کم یا زیادہ ہو سکتے ہیں، اور دعا کی وجہ سے بھی تقدیر بدلی جا سکتی ہے، اس طرح کی تقدیر معلق کہلاتی ہے، لیکن اہل علم فرماتے ہیں کہ: معلق اور مبرم محض تقسیم ظاہری ہے (جو بندوں کے اعتبار سے ہے) ورنہ دراصل تقدیر مبرم ہی ہوتی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر تقدیر مبرم ہی

ہے) کیونکہ تقدیر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی تجویز کو وہ بدل ہی نہیں سکتی اگر کوئی تقدیر معلق ہو دعا دیا دوا پر اور دعا و دوا سے اس کا وقوع ہو گیا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تقدیر میں یہ بھی تھا کہ دعا کی ہوگی اور اس سے بلا جاتی رہے گی یا مثلاً تقدیر میں یہ ہو کہ دوا کرے گا تو اچھا ہو گا، لیکن یہ واقعہ کہ کرے گا یا نہیں یہ تو مبرم ہی ہے، لہٰذا تقدیر در اصل مبرم ہی ہوتی ہے۔ (ملفوظات اشرفیہ)

نوٹ: بعض دفعہ لوگ سوچتے ہیں کہ جب ہر کام مقدر من اللہ ہے تو پھر تدابیر اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور ایمان و اعمال سے کیا ہوگا؟ یہ سوچنے کا انداز درست نہیں، کیونکہ تقدیر اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ تدبیر اور کسب اختیار کرنا جائز ہے، کیونکہ تقدیری نظام مخفی ہے (کسی کو علم نہیں کہ اس کے بارے میں کیا لکھا ہے جب علم نہیں تو اچھے اعمال ہی کرنے چاہئے) اور تکوینی نظام ظاہر ہے جس کا انسان مکلف ہے، مثلاً کفر و شرک اور چوری وغیرہ اختیاری افعال ہیں، ان میں تقدیر کا حوالہ دینا درست نہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک چور نے چوری کر کے تقدیر کا سہارا لیکر کہا کہ: "اللہ قدر لي هذا" حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے چور کا ہاتھ کاٹ کر اس کو کوڑے بھی لگوائے اور فرمانے لگے: "القطع للسرقة والجلد للكذب على الله" (حاشية الإبانة عن أصول الديانة) دوسری بات یہ ہے کہ دنیا کے بارے میں کوئی یہ سوچ کر کہ جو کچھ مقدر ہے وہی ملے گا اسباب حصول رزق ترک نہیں کرتا، پھر آخرت کے بارے میں یہ منفی رویہ کیوں ہے؟

> وذلك من عقد الإيمان، وأصول المعرفة والاعتراف بتوحيد الله تعالى وربوبيته كما قال تعالى في كتابه: ﴿وخلق كل شيء فقدره تقديرا﴾ (الفرقان: ٢) وقال تعالى: ﴿وكان أمر الله قدرا مقدورا﴾ (الأحزاب: ٣٨)
>
> مذکورہ حقائق کو ماننا ایمان کی پختگی، معرفت کی بنیاد، توحید باری تعالیٰ اور اس کی ربوبیت کا اعتراف ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا: "اور اس نے ہر چیز پیدا کر کے ٹھیک اندازہ پر رکھی اور اللہ کا حکم مقدر ہو چکا تھا۔"

وذلك: الإشارة إلى ما تقدم من الإيمان بالقدر وسبق علمه

بالكائنات قبل خلقها. عقد الإيمان: من إضافة الصفة إلى الموصوف أي الإيمان المعقود عليه بالإيقان. والاعتراف: بالرفع عطف على المصدر المتأول من أن نعلم. أي الواجب العلم والاعتراف

> فويل لمن صار لله في القدر خصيماً، وأحضر للنظر فيه قلباً سقيماً، لقد التمس بوهمه في فحص الغيب سراً كتيماً، وعاد بما قال فيه أفاكاً أثيماً.
>
> تو بربادی و ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو تقدیر کے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے جھگڑا کرنے والا ہو گیا اور جس نے تقدیر میں غور و فکر کے لئے بیمار دل کو حاضر کیا، وہ اپنے وہم و گمان کے مطابق غیب کی جستجو میں پوشیدہ رازہائے خداوندی کو تلاش کرنے لگا اور اس طرح تقدیر کے بارے میں جو کچھ اس نے کہا جھوٹا اور گنہگار ٹھہرا۔

لقد التمس ...: ماقبل کی علت ہے۔ أي طلب بوهمه في البحث عن الغيب سراً مكتوماً. حاصل یہ کہ "القدر سر الله في خلقه" کا قاعدہ مسلّم ہے لیکن جب کوئی شخص ان رازہائے خداوندی کو تلاش کرنے لگا تو زیادہ "اطلاع علی الغیب" کا قصد وارادہ کرتا ہے حالانکہ ارشاد ہے کہ ﴿عالم الغيب فلا يظهر على غيبه أحدا﴾ [الجن ٢٦] وعاد بما قال فيه: أي في القدر. أفاكاً: كذاباً. أثيماً: أي مجرماً.

عرش و کرسی

> والعرش والكرسي حق
>
> عرش الٰہی اور کرسی برحق ہیں۔

العرش في اللغة: عبارة عن السرير الذي للملك. جیسے بلقیس کے تخت کے بارے میں فرمایا: ﴿ولها عرش عظيم﴾ [النمل]

رہا یہ کہ اس سے کیا مراد ہے؟ تو جاننا چاہیے کہ "عرش" کے متعلق نصوص سے اس قدر ثابت ہے کہ عرش ایک عظیم جسم ہے جو زمین و آسمان سے بہت بڑا ہے، عرش کے پائے ہیں اور حاملین فرشتے ان پایوں کو اٹھانے والے ہیں اور ساتوں آسمانوں کے اوپر تمام عالم کے لئے ایک قبہ کی طرح ہے اور یہ تمام مخلوقات کی چھت ہے۔ بعضوں نے اس کی تفسیر اس

بسلیق بشانہ) لیکن یہ مخلوق اور استوا اس وجہ سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش کا محتاج ہے بلکہ اس میں اللہ کی حکمت ہے۔ ایک نسخہ میں لفظ آیا ہے "وبما فوقه" ای محیط بما فوق کل شيء وبما تحته وبما وراءه۔ اس صورت میں مطلب واضح ہے لیکن ایک دوسرے نسخہ میں ہے وفوقه۔ أي انه سبحانه محیط بکل شيء وفوق کل شيء أي فوق المخلوقات۔ اب اس صورت میں اللہ کے لئے فوقیت اور علو کا ثبوت ہوگا مگر یہ مکان اور جہت کو مستلزم نہیں فوقیت بدون الجهة ہے۔ اللہ اعلیٰ ہے جو بے مکانی نہیں اگر اس سے کوئی جہت "فوق" ثابت کریں پھر تو اللہ کا ہوگا اور وہ جہت ومکان محیط۔ "فتعالی الله عن الجسم والجهات" قرآن کریم میں جہاں اللہ کے لئے "فوق" کا لفظ استعمال ہوا ہے مفسرین نے اس کے معنی "بلندی مرتبہ اور برتری" سے کیے ہیں اور بعض نے متشابہات سے قرار دیا۔

فائدہ: وليس المراد من إحاطته بخلقه انه كالفلك، وان المخلوقات داخل ذاته المقدسة وانما المراد إحاطة عظمة، وسعة، وعلم، وقدرة، وقد أعجز عن الإحاطة خلقه: أي لايحيطون به علما ولا رؤية ولا غير ذلك من وجوه الإحاطة.

غرض یہ کہ کوئی چیز اللہ کا احاطہ نہیں کر سکتی، ورنہ محدود ہونا لازم آئے گا۔ "سبحان من لايبلغ الواصفون وصفه، ولايقدر أحد قدره"

ونقول: إن الله اتخذ ابراهيم خليلا، وكلم موسى تكليما إيمانا وتصديقا وتسليما.
ہم سے ایمان، صدق دل اور تسلیم و رضا سے ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خالص دوست بنایا اور موسیٰ علیہ السلام سے بات چیت کی۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿واتخذ الله إبراهيم خليلا﴾ (النساء ۱۲۵) اللہ تعالیٰ نے بنایا ابراہیم علیہ السلام کو خالص دوست۔

الخلة: كمال المحبة. خلیل کے معنی ہیں کہ جس کے دل میں محبت اس طرح راسخ ہو جائے کہ کسی اور کے لئے اس میں جگہ نہ رہے۔ خلیل بروزن فعیل بمعنی فاعل ہے

جیسے علیم بمعنی عالم۔ اور بعض کہتے ہیں بمعنی مفعول ہے جیسے حبیب بمعنی محبوب اور حضرت ابراہیم علیہ السلام یقیناً اللہ کے محب بھی تھے اور محبوب بھی۔ (فتح القدیر) "خـلـة" کے اس مرتبہ میں ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ساتھ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے: "لو كنت متخذا من أهل الأرض خليلاً، لاتخذت أبابكر خليلاً ولكنّ صاحبكم خليل الله." (بخاری فی خلق افعال العباد)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود خلیل اللہ ہیں، "وفي رواية إن الله اتخذني خليلاً كما اتخذ ابراهيم خليلاً."

موسیٰ علیہ السلام کے کلیم اللہ ہونے کے بارے میں فرمایا: ﴿وكلّم الله موسىٰ تكليماً﴾ (نساء: ۱۶٤)

اور موسیٰ علیہ السلام سے اللہ نے صاف طور پر کلام کیا (واضح رہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے مشافہۃً کلام نہیں سنا، بلکہ پس پردہ صرف آواز سنی) یہ موسیٰ علیہ السلام کی وہ خاص صفت ہے جس میں وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام سے ممتاز ہیں، لیکن اس مرتبہ "تکلم" میں بھی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہیں۔ كما ثبت ذلك في حديث الإسراء "بلکہ ابن کثیر نے اس صفت ہم کلامی میں حضرت آدم علیہ السلام کو بھی شریک مانا ہے (ابن کثیر زیر آیت ﴿تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض﴾۔

جہمیہ نے حقيقة المحبة من الجانبين اور حقيقة التكليم دونوں سے انکار کیا، چنانچہ انہوں نے اس کا انکار کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہوں یا موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ ہوں۔

فرشتوں، پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان

ونؤمن بالملائكة، والنبيين، والكتب المنزلة على المرسلين. ونشهد أنهم كانوا على الحق المبين.
ہم فرشتوں، انبیاء علیہم السلام اور رسولوں پر نازل کی گئی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام کھلے حق پر تھے۔

مندرجہ بالا پانچ امور ارکان ایمان کہلاتے ہیں۔ قال ابو طالب المکی رحمہ اللہ: أركان الإيمان سبعة، يعني هذه الخمسة والإيمان بالقدر والإيمان بالجنة والنار. "باقی تین کا ذکر انشاء اللہ آگے فرمائیں گے۔

ملائکہ کی تعریف

"الملائكة أجسام لطيفة تظهر في صور مختلفة وتقوى على أفعال شاقة، هم عباد مكرمون يواظبون على الطاعة والعبادة، ولا يوصفون بالذكورة والأنوثة." (شرح المقاصد: ۳/۳۱۹) فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے فرشتوں کا انکار کرنے والا مومن نہیں۔ ایسے ہی تمام انبیاء اور مرسلین پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان اس شخص کا معتبر ہے جو انبیاء کرام پر ایمان رکھتا ہے۔ جن آسمانی کتابوں اور صحیفوں کا ثبوت دلائل قطعیہ سے ہے ان پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔

> ونسمي أهل قبلتنا مسلمين مؤمنين، ما داموا بما جاء به النبي ﷺ معترفين، وله بكل ما قاله وأخبر مصدقين غير مكذبين
>
> ہم اہل قبلہ کو اس صورت میں مسلمان و مومن کہتے ہیں، جب تک وہ اس دین پر قائم رہیں، جو رسول اکرم ﷺ لے کر آئے، اور اس دین کا اعتراف کریں، اور جو کچھ آپ نے فرمایا اور جس کی خبر دی اس کی تصدیق کرتے ہیں، نہ کہ تکذیب اور آپ کی تمام باتوں اور احادیث کو سچے دل سے تسلیم کرتے ہیں۔

اہل قبلہ کی تعریف

واضح رہے کہ ضروریات دین سے مراد یہ ہے کہ وہ مشہور ہو اور ہر وہ شخص جسے کچھ بھی دین سے تعلق ہو اس کو من الدین کہتا ہو، یعنی وہ اس کے اجلی البدیہیات مسائل سے ہو۔ اب اہل قبلہ کی تعریف کیجئے اہل قبلہ وہ کہلاتے ہیں کہ جو تمام ضروریات دین (مثلاً حدوث عالم، حشر الاجساد، علم اللہ بالکلیات والجزئیات اور ختم نبوت وغیرہ) پر ایمان رکھتے ہوئے قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے ہوں۔ اہل قبلہ کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ جو بھی شخص صرف قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھتا ہو، چاہے وہ کسی قطعی حکم کا منکر بھی کیوں نہ ہو، کیونکہ قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز تو مسیلمہ کذاب

بھی پڑھتا تھا جب اقرار کرنے کے بعد کسی بھی ایک امر ضروری کا انکار کرے تو وہ بھی قبلہ ہوگا اسی طرح مؤول کو کافر نہیں کہنا چاہیے لیکن مؤول اگر تاویل کرتے ہوئے قطعیات (جو ضروریات دین سے ہو) کا انکار کرے تو ایسا متأول کافر ہو جائے گا۔ لفظ "مؤمنین ومسلمین" لاکر امام طحاوی نے ایمان واسلام کے ترادف واتحاد کی طرف اشارہ کیا۔

> **ولا نخوض في الله، ولا نماري في دين الله.**
>
> ہم ذات خدا میں سوچ وبچار نہیں کرتے اور نہ ہی اللہ کے دین میں جھگڑتے ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی روایت ہے فرمایا: "لا ينبغي لأحد أن ينطق في ذات الله بشيء، بل يصفه بما وصف به نفسه" (شرح عقیدۃ الطحاویہ للمیدانی)

"ولا نماري في دين الله" علامہ میدانی نے اس کا مطلب لکھا ہے: أي "لا نتساهل في دين الله" اللہ کے دین میں ہم بے پرواہی اور سستی سے کام نہیں لیتے ہیں۔ ابن ابی العزؒ اس کی شرح میں فرماتے ہیں: "لا نخاصم أهل الحق بإلقاء شبهات أهل الأهواء عليهم امتثالا لامترائهم وميلهم، لأنه في معنى الدعاء إلى الباطل، وتلبيس الحق، وإفساد دين الإسلام" بہر حال "الخوض في الله" اور "المماراة في الدين" دونوں منع ہیں۔

> **ولا نجادل في القرآن ونشهد أنه كلام رب العالمين نزل به الروح الأمين، فعلّمه سيد المرسلين محمدا ﷺ وعلى آله أجمعين وهو كلام الله تعالى، لا يساويه شيء من كلام المخلوقين، ولا نقول بخلقه ولا نخالف جماعة المسلمين.**
>
> ہم قرآن کے ظاہری معانی میں جھگڑا نہیں کرتے۔ بلکہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ سارے عالم کے پروردگار کا کلام ہے، جبریل علیہ السلام اسے لیکر نازل ہوئے اور سارے نبیوں کے سردار ﷺ کو یہ کلام سکھلایا، بلاشبہ یہ کلام الٰہی ہے، مخلوق کا کلام اس کے مساوی نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی ہم اللہ کے کلام کو مخلوق کہتے ہیں اور نہ مسلمانوں کی جماعت کی مخالفت کرتے ہیں۔

ولا نجادل اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ (۱) لا نقول في القرآن كما قال أهل الزيغ واختلفوا وجادلوا بالباطل ليدحضوا به الحق، بل نقول إنه كلام رب العالمين إلى آخر كلامه (۲) أنا لا نجادل في القراءات الثابتة بل نقرؤه بكل ما ثبت وصح. **الروح الأمين** : هو جبريل عليه السلام، سمي روحا، لأنه حامل الوحي الذي به حياة القلوب وسمي أمينا، لأنه أمين حق أمين. **فعلمه** : یعنی جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو قرآن کی تعلیم دی، یہ دراصل قرامطہ وغیرہ کی تردید ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اللہ کے رسول نے الہام کے طور پر اپنے دل ہی دل میں قرآن کے مضامین کا تصور کیا۔ وهو كلام الله لا يساويه .... : کلام اللہ چونکہ رب العالمین کی صفت ہے اور یہ حقیقت ہے کہ "ان من شبه من صفات الله بشيء من صفات المخلوقين، كان من الكافرين. ولا نقول بخلق القرآن: لأن الخلق صفة المحدث العديم والقرآن كلام الله قديم. **جماعة المسلمين** : أي يجب علينا أننا لا نخالف السواد الأعظم أهل السنة والجماعة في جميع ما اتفقوا عليه، فإن خلافهم زيغ، وضلال، وبدعة وفيه تنبية على أن من قال بخلق القرآن فقد خالف جماعة المسلمين.

نوٹ مسلمانوں کی جماعت سے پاکستان کی "جماعۃ المسلمین رجسٹرڈ" جس کی داغ بیل تیس سال قبل ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نے ڈالی، مراد نہیں، بلکہ صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کی جماعت مراد ہے، جس کی تعبیر اہل السنت والجماعت سے کی جاتی ہے اور یہ دراصل "ما انا عليه واصحابي" سے ماخوذ ہے۔ دراصل اہل مذہب (غیر مقلدین) سے الگ ہو کر مسعود احمد نے صرف پاکستان کی سطح پر شرذمہ قلیلہ "جماعۃ المسلمین پاکستان" کو رجسٹرڈ کروا کر ساری دنیا کے مسلمانوں کو غیر مسلم اور خارج از اسلام قرار دیا اور بجائے فرقہ واریت کے خاتمہ کے ایک نئے فرقہ نے جنم لیا، صرف نام رکھ لینے سے کچھ نہیں بنے گا، جس طرح بعض حضرات نے اپنے آپ کو سنی کہنا شروع کر دیا ہے، لیکن سنی نام رکھ لینا اور سنت کی خلاف ورزی کرنا آخرت میں ہرگز مفید نہیں ہوگا۔ اسلام اور مسلمین کی صفت سے حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی وغیرہ متصف ہیں، موجودہ مسعود احمدی

پارٹی بلکہ جماعۃ المسلمین ہے۔

> ولا نکفر احداً من اهل القبلة بذنب مالم يستحله ولا نقول: لا يضر مع الإيمان ذنب لمن عمله.
>
> ہم کسی اہل قبلہ (مسلمان) کو کسی گناہ کو عقیدے کے اعتبار سے جائز وحلال نہیں سمجھتے ہم انہیں کافر قرار نہیں دیتے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ایمان کے ساتھ کوئی گناہ مضر نہیں اس شخص کے لئے جس نے گناہ کیا۔

خوارج اور مرجئہ افراط وتفریط کے شکار ہیں، چنانچہ خوارج ہر گناہ کے مرتکب کو کافر قرار دیتے ہیں، جبکہ مرجئہ کسی قسم کا گناہ ایمان کے لئے مضر نہیں سمجھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ: "حسناتنا مقبولة وسيئاتنا مغفورة" "ولا نكفر" سے خوارج اور "ولا نقول: لا يضر" سے امام طحاویؒ نے مرجئہ کی تردید کی طرف اشارہ کیا۔ اہل السنۃ والجماعۃ عاصی اور فرد مجرم کے لئے عقاب وثواب قطعی اور یقینی نہیں سمجھتے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر چھوڑتے ہیں۔

نوٹ کسی بدعملی اور گناہ سے مسلمان کافر نہیں ہوتا، لیکن ایسی بدعملی جو امارات کفر وعلامت تکذیب ہو آدمی کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتی ہے۔ مثلاً بت کو سجدہ کرنا، قرآن کریم کو نجاست میں ڈالنا، نبی یا ولی سے مدد طلب کرنا کفر ہے۔ (شرح عقائد ۱۰۰)

> ونرجوا للمحسنين من المؤمنين، أن يعفو عنهم ويدخلهم الجنة برحمته ولا نأمن عليهم، ولا نشهد لهم بالجنة ونستغفر لمسيئهم ونخاف عليهم ولا نقنطهم
>
> ہم مؤمنین میں سے نیک لوگوں کے بارے میں امید رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا اور انہیں اپنی رحمت سے جنت میں داخل فرمائے گا اور ہم ان پر بے خوف نہیں ہیں، لیکن جنت میں یقینی داخلے کی ہم گواہی نہیں دیتے، ہم گنہگاروں کے لئے بخشش کی دعا کرتے ہیں، ہمیں ان کے متعلق ڈر ہے، لیکن ہم انہیں مایوس نہیں کرتے۔

نیک لوگ باوجود نہایت قرب کے ان کی امیدیں محض حق تعالیٰ کی مہربانی سے وابستہ ہوتی ہیں اور اس کے عذاب سے ہمیشہ لرزاں وترساں رہتے ہیں جیسا کہ

لئے تو کہا گیا ہے کہ "الإیمان بین الخوف والرجاء" منافق اور گنہگار شخص برائی کے ارتکاب کے باوجود اللہ کے عذاب سے بے خوف رہتا ہے، حالانکہ اس کو چاہئے کہ اپنے بارے میں ڈرے مگر اللہ سے مایوس بھی نہ ہو۔ لانأمن علیهم : أي ولكن لانأمن علیهم مكر الله تعالى إذ لايأمن مكر الله إلا القوم الخاسرون" یعنی اللہ تعالی کے عذاب کے سلسلے میں ہم ان پر بے خوف نہیں، کیونکہ خسارہ کرنے والے لوگ ہی اللہ کے عذاب سے بے خوف ہوتے ہیں۔ لانقنطهم: لیکن ہم انہیں مایوس نہیں کرتے۔ إذ لاییأس من روح الله إلا القوم الكافرون قال أبو علي الروذباري رحمه الله : "الخوف والرجاء كجناحي الطائر إذا استويا استوى الطير، وتم طيرانه وإذا نقص أحدهما وقع فيه النقص وإذا ذهبا صار الطائر في حد الموت" اسی کو آگے امام طحاویؒ فرماتے ہیں۔

> والأمن والإياس ينقلان عن ملة الإسلام وسبيل الحق بينهما لأهل القبلة
>
> بے خوفی اور مایوسی ملت اسلام سے خارج کرتی ہے۔ اہل قبلہ، مسلمانوں کے لئے سیدھا راستہ ان دونوں کے درمیان ہے۔

الأمن: یعنی اللہ کے عذاب سے بے خوفی۔ والإياس: اللہ کی رحمت سے مایوسی۔

وسبيل الحق: أي وسبيل القول الحق ما بينهما وهو القول لأهل القبلة.

> ولايخرج العبد من الإيمان إلا بجحود ما أدخله فيه
>
> بندہ مومن ایمان کے دائرہ سے اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک کہ ان باتوں کا انکار کردے جن کی بناء پر وہ ان میں داخل ہوا تھا۔

امام طحاویؒ نے اس عبارت میں خوارج اور معتزلہ کی تردید کی ہے، جن کا مسلک یہ ہے کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہوجاتا ہے (خوارج کے ہاں ایمان سے خارج ہونے کے بعد کفر میں داخل ہوتا ہے، جبکہ معتزلہ کا خیال یہ ہے کہ ایمان سے تو نکل جاتا ہے مگر کفر میں بھی داخل نہیں ہوتا، اس حالت کو وہ "منزلة بين المنزلتين" سے تعبیر کرتے ہیں)۔

إلا بجحود ما أدخله فيه: "أدخل" کی ضمیر فاعل سے ما موصولہ ہے۔ "ہ" کی ضمیر مفعول "عبد" کی طرف راجع ہے۔ فیہ کی ضمیر مجرور ایمان کی طرف راجع ہے۔ غرضیکہ قطعیات میں سے ضروریاتِ دین کا انکار کیے بغیر بندہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔

نوٹ: مصنفؒ بار بار تقریباً ایک ہی عقیدہ کو مختلف الفاظ و اسلوب میں بیان فرما دیتے ہیں تاکہ "أوقع في الذهن" ہو جائے۔

والإيمان هو الإقرار باللسان والتصديق بالجنان.
ایمان زبان سے کہنے اور دل سے سچا جاننے کا نام ہے۔

"ایمان" باب افعال سے ہے، جو "أمن" سے ماخوذ ہے۔

الإيمان في الأصل جعل الغير آمنا ثم وضع للتصديق لأن المصدق كأنه يجعل المخبر آمنا من التكذيب والمخالفة.

ایمان کی شرعی تعریف: (۱) متن میں امام طحاویؒ نے امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب سے جو تعریف نقل کی ہے، یہ ایمان کی شرعی تعریف ہے، اس تعریف کی تشریح [illegible] یوں ہے "الإيمان في الشرع هو تصديق النبي ﷺ بالقلب في جميع ما جاء به من عند الله تعالى والإقرار بجميع ما جاء به النبي ﷺ" گویا اس تعریف کی رو سے ایمان کا تعلق قلب اور لسان سے ہے یعنی یہ دونوں ایمان کے رکن ہیں۔

(۲) لیکن شیخ ابو منصور ماتریدیؒ کا کہنا ہے کہ "إن الإقرار باللسان ركن زائد ليس بأصلي فالإيمان هو التصديق بالقلب وإنما الإقرار شرط لإجراء الأحكام في الدنيا من حرمة الدم والمال، وصلوة الجنازة عليه، ودفنه في مقابر المسلمين" بعض حضرات کا خیال ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی مسلک ہے، اس مذہب کی رو سے ایمان کا تعلق صرف قلب ہی سے ہے اور زبان سے اقرار کرنا اجراءِ احکامِ اسلام کے لئے شرط ہے، کیونکہ کسی کا مسلمان ہونا زبانی اقرار سے ہی معلوم ہوگا، چنانچہ اگر ایک شخص دل سے تصدیق کرتا ہے اور زبان سے اقرار نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مسلمان ہے۔

(۳) "ذهب مالک، والشافعي، وأحمد وغيرهم إلى أن الإيمان تصديق بالجنان، وإقرار باللسان، وعمل بالأركان" اس مذہب کی رو سے ایمان کا تعلق قلب، لسان اور جوارح تینوں سے ہے۔

دلائل اور مزید تفصیل شرح عقائد میں ہے اگلے سال مشکوٰۃ شریف اور اس سے اگلے سال بخاری شریف میں بھی پڑھ لیں گے۔

وجميع ما صح عن النبي صلى الله عليه وسلم من الشرع والبيان كله حق. جو کچھ شرع اور بیان کی باتیں، جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے درست ہو، سب کے سب حق ہیں۔

اس عبارت میں تعطیل نصوص کی تردید ہو رہی ہے، کیونکہ اہل حق نص صحیح سے عدول نہیں کرتے، جبکہ جہمیہ، معطلہ، معتزلہ اور روافض وغیرہ ظاہری نصوص کو بسا اوقات معطل کر کے ظاہر سے عدول کرتے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے ارشادات دو قسم کے ہیں:

(الف) وہ ہیں کہ جن میں ایسے احکام جدیدہ کو شروع فرمایا کہ جو قرآن میں مذکور نہیں۔

(ب) وہ ہیں جن میں احکام قرآنی کی وضاحت اور تفسیر ہو۔ امام طحاوی نے اپنے قول "عن الشرع والبیان" سے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

والإيمان واحد وأهله في أصله سواء والتفاضل بينهم بالتقوى ومخالفة الهوى وملازمة الأولى ایمان واحد ہے اور اس کے اہل (تمام مؤمنین) اس کی اصل (ایمان) میں برابر ہیں، لیکن ایک دوسرے پر برتری تقویٰ، اپنی خواہشات نفسانی کی مخالفت اور اولیٰ وافضل کو لازم پکڑنے کی وجہ سے ہے۔

الإيمان واحد: لأن الإيمان التصديق البالغ حد الجزم

والإذعان الذي لايقبل التشكيك، والأعمال غير داخلة في حقيقة الإيمان. وأهله: أي أهل الإيمان من الملائكة والأنبياء والأولياء وسائر المؤمنين الأبرار والفجار في أصله - الذي هو التصديق كلهم فيه. سواء: أي لاتفاضل فيه من حيث ذاته ولايزيد ولاينقص. الحاصل أن التفاوت بين المؤمنين بأعمال القلوب. وأما التصديق فلاتفاوت فيه. قال أبو حنيفة وأصحابه رحمهم الله: لايزيد الإيمان ولاينقص، واختاره من الأشاعرة إمام الحرمين، وذهب عامتهم إلى زيادته ونقصانه.

غرضیکہ مؤمنین نفس ایمان میں سب برابر ہیں، ان میں تفاضل اور مراتب ایمانی کا اختلاف تقویٰ، اخلاص کی زیادتی اور اعمالِ صالحہ کی کمی بیشی کی بناء پر ہے۔

> والمؤمنون كلهم أولياء الرحمن وأكرمهم عند الله، أطوعهم وأتبعهم للقرآن.
>
> سب اہلِ ایمان رحمان کے دوست ہیں ان میں سب سے زیادہ عزت والا قرآن کی سب سے زیادہ اطاعت کرنے والا اور زیادہ پیروی کرنے والا ہے۔

الولي: من الولاية (بفتح الواو) التي هي ضد العداوة. الولي: خلاف العدو، وهو مشتق من الولي. وهو الدنو والتقرب. فولي الله: هو من والى الله بموافقته في محبوباته، والتقرب إليه بمرضاته. قال صاحب شرح العقائد: الولي: هو العارف بالله وصفاته حسب مايمكن، المواظب على الطاعات، المجتنب عن المعاصي المعرض عن الإنهماك في اللذات والشهوات.

فالمؤمنون أولياء الله، والله تعالى وليهم وأما أولياء الله الكاملون، فهم المذكورون في قوله تعالى ﴿ألا إن أولياء الله لاخوف عليهم ولاهم يحزنون.﴾ [الآية] (يونس ٦٢-٦٣)

والإيمان: هو الإيمان بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر، والقدر خيره وشره وحلوه ومره من الله تعالى

ایمان نام ہے سچے دل سے یقین کرنے کا اللہ تعالیٰ پر اس کے فرشتوں پر اس کی آسمانی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر اور یہ کہ اچھی بری میٹھی کڑوی تقدیر اللہ کی طرف سے ہے۔

الإيمان: أي الإيمان المطلوب من المكلف. هو الإيمان: أي الإقرار مع التصديق والإذعان. بالله: تعالى بأنه موجود بصفاته الواجبة له، منزها عما يستحيل عليه. وملائكته: بأنهم عباد الله المكرمون، لا يعصون الله ما أمرهم، ويفعلون ما يؤمرون وبأنهم سفراء (قرجود) الله بينه وبين خلقه. وكتبه: بأنها كلام الله تعالى الأزلي القديم المنزه عن الحروف والأصوات، وبأنه تعالى أنزلها على بعض رسله بألفاظ حادثة في ألواح أو على لسان ملك. ورسله: بأنه أرسلهم إلى الخلق لهدايتهم، وأيدهم بالمعجزات، وبأنهم معصومون من الصغائر والكبائر قبل النبوة وبعدها. واليوم الآخر: وهو من الموت إلى آخر ما يقع يوم القيامة. وفي بعض النسخ والبعث بعد الموت: فهو إما تاكيد لليوم الآخر وإما من عطف الخاص على العام.

ونحن مؤمنون بذلك كله، لا نفرق بين أحد من رسله ونصدقهم كلهم على ما جاؤا به.

ہم ان تمام باتوں پر ایمان رکھتے ہیں رسولوں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور وہ جو پیغام لائے تھے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

بذلک: سے اشارہ ہے ان تمام مذکورہ امور کی طرف جن پر تفصیلی ایمان لانا واجب ہے۔ لانفرق بين أحد من رسله: أي لا نفرق بينهم بأن نؤمن ببعض، ونكفر ببعض، بل نؤمن بهم ونصدقهم كلهم. یعنی یہود و نصاریٰ کی طرح کام نہیں کرتے۔ جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہی

یا ہمگر خاتم الانبیاء ﷺ کو نبی نہ مانا۔ وکذلک لانفرق بین أحد من کتبه.

وأهل الكبائر من أمة محمد ﷺ في النار لا يخلدون إذا ماتوا وهم موحدون وإن لم يكونوا تائبين بعد أن لقوا الله عارفين مؤمنين وهم في مشيئته وحكمه، إن شاء غفر لهم وعفا عنهم بفضله، كما ذكر عز وجل في كتابه ﴿ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء﴾ وإن شاء عذبهم في النار بعدله، ثم يخرجهم منها برحمته، وشفاعة الشافعين من أهل طاعته، ثم يبعثهم إلى جنته؛ وذلك بأن الله تعالى مولى أهل معرفته، ولم يجعلهم في الدارين كأهل نكرته الذين خابوا من هدايته ولم ينالوا من ولايته. اللهم يا ولي الإسلام وأهله، مسّكنا بالإسلام حتى نلقاك به.

آنحضرت ﷺ کی امت میں سے کبیرہ گناہ کے ارتکاب کرنے والے جہنم میں جائیں گے، لیکن وہ اس میں ہمیشہ نہیں رہیں گے، درآنحالیکہ موت کے وقت وہ موحدین ہوں، اگرچہ کبیرہ گناہوں سے توبہ نہ کی ہو، لیکن اللہ تعالیٰ سے جب ملے ہوں تو توحید باری تعالیٰ کی معرفت اور اللہ کی ذات پر مومن ہونے کی حالت میں ملے ہوں، ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکم کے تحت ہوں گے اگر وہ چاہے تو ان کو بخش دے اور انہیں اپنے فضل وکرم سے معاف کردے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تذکرہ فرمایا: "شرک کے علاوہ اور گناہ جس کو چاہے معاف کردے" اور اگر وہ چاہے تو انہیں جہنم میں اپنے عدل وانصاف کے مطابق سزا دے، پھر انہیں اس سے اپنی رحمت اور اپنے فرمانبردار بندوں کی سفارش کی بناء پر نکال دے، اور انہیں جنت میں داخل کردے یہ اس لئے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو دوست بنایا ہے اور انہیں دنیا وآخرت میں منکرین کے برابر قرار نہیں دیا، جو ہدایت الٰہی سے محروم رہے اور اس کی دوستی کو نہ پا سکے۔ اے اللہ! اے اسلام اور اہل اسلام کے دوست! ہمیں اسلام پر ثابت قدم رکھ، حتیٰ کہ تجھ سے اسی حالت میں ملاقات کریں۔

وأهل الكبائر ..... رد لقول الخوارج والمعتزلة، القائلين، بتخليد أهل الكبائر في النار۔

غرضیکہ اللہ چاہے تو گناہ کو معاف کر سکتا ہے اور اگر چاہے تو گرفت کر سکتا ہے، معاف کرنا اس کا فضل و احسان ہے اور گرفت کرنا اس کا عدل ہے۔

من أمة محمد ﷺ. الإشكال: تخصيصه أمة محمد ﷺ. يفهم منه أن أهل الكبائر من أمة غير محمد ﷺ. حكمهم مخالف لأهل الكبائر من أمة محمد.

الجواب: (١) ليس في بعض النسخ ذكر الأمة. (٢) المراد جميع أمم الأنبياء عليهم الصلاة والسلام وخصه بالذكر إنما لاتفاق الحكم في جميع الأمم فإذا علم حكم أمته علم الحكم في جميع الأمم الماضية حيث كانوا كلهم جاؤوا بالتوحيد.

في النار: معمول لقوله: "لا يخلدون." عارفين لله بالتوحيد.

مؤمنين: منه فيه رد على الجهمية القائلين بمعرفته فقط وإلا فابليس يعرفه وشفاعة الشافعين من أهل طاعته: كالنبياء ورسله وأهل معرفته وذلك باذنه ومشيئته للأحاديث الكثيرة المتواترة. أهل معرفته: أي أهل الإيمان أهل نكرته: أي الكفار، بأن الله مولى لأهل معرفته: كما قال تعالى: ﴿ذلك بأن الله مولى الذين آمنوا وأن الكافرين لا مولى لهم﴾

متمسكنا: بعض نسخوں میں اس کی جگہ "نمسا" ہے، دونوں کا مفہوم ایک ہے یعنی اسلام پر استقامت کی دعاء۔

وترى الصلاة خلف كل بر وفاجر من أهل القبلة، ونصلي على من مات منهم. ہم اہل قبلہ (مسلمانوں) میں سے ہر نیک و گناہگار امام کے پیچھے نماز پڑھنے کو درست سمجھتے ہیں اور اسی طرح ہر نیک اور گناہگار کی نماز جنازہ پڑھنا شرعاً جائز سمجھتے ہیں۔

(ونرى الصلاة) أي جائزة (خلف كل بر) مهتد (وفاجر) معتد حيث كان (من أهل القبلة)؛ لقوله ﷺ: "صلوا خلف كل بر وفاجر" (أخرجه البيهقي في السنن والفتح الكبير) ولأن علماء الأمة كانوا يصلون خلف الفسقة، وأهل الأهواء، والبدعة من غير نكير، وفي صحيح البخاري: أن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما كان يصلي خلف الحجاج بن يوسف الثقفي، وكذا أنس بن مالك رضي الله عنه، وكان الحجاج فاسقا ظالما وما نقل عن بعض السلف من المنع عن الصلاة خلف المبتدع فمحمول على الكراهة، إذ لا كلام في كراهة الصلاة خلف الفاسق والمبتدع وهذا إذا لم يؤد الفسق أو البدعة إلى حد الكفر وإلا فلا كلام في عدم جواز الصلاة خلفه. كذا في شرح العقائد.

(ونصلي على من مات منهم): أي ونرى الصلاة (نماز جنازہ) على من مات من الأبرار والفجار بالشرط المتقدم. حدیث میں ہے: "والصلاة واجبة على كل مسلم برا كان أو فاجرا وإن عمل الكبائر." (أبو داود، مشكاة، باب الإمامة، ١٠٠)

البتہ اس عموم سے باغی لوگ، قطاع الطریق، اور وہ منافق جس کا نفاق معلوم ہو، مستثنیٰ ہیں، کیونکہ ان پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ فقہاء کرام نے ان لوگوں کی نماز جنازہ پڑھنے سے زجراً منع کیا ہے۔ واضح رہے کہ قطاع الطریق اگر عین جنگ کے موقع پر قتل کردیے جائیں تو نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ ورنہ پڑھی جائے گی، خودکشی کرنے والے کی بھی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ (الشامی، باب صلاة الجنائز) والدین کے قاتل کو اگر امام نے قصاصاً قتل کیا ہو، تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، اگر طبعی موت مرا ہو پھر پڑھی جائے گی۔

ولا ننزل أحدًا منهم جنةً ولا نارًا ولا نشهد عليهم بالكفر ولا بشرك ولا بنفاق، ما لم يظهر منهم شيء من ذلك ونذر سرائرهم إلى الله تعالى.

اہل قبلہ میں سے ہم کسی فرد کو جنتی یا جہنمی قرار نہیں دیتے (قطعی اس کو جنتی یا دوزخی نہیں کہتے) اور نہ ہی کسی پر کفر، شرک یا نفاق کی شہادت دیں گے۔ جب تک ان چیزوں (کفر، شرک وغیرہ) کا ان سے ظہور نہ ہو جائے۔ ہم ان کی پوشیدہ باتوں (چھپی ہوئی) کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔

يريد: أنا لا نقول عن أحد معين من أهل القبلة. أنه أهل الجنة او من أهل النار، لأن حقيقة باطنه، وما مات عليه لا نحيط به، لكن نرجو للمحسن، ونخاف على المسيء (گناہ گار) ولا نشهد عليهم ....: لأنا قد أمرنا بالحكم الظاهر ونهينا عن الظن واتباع ما ليس لنا به علم. ہاں عشرہ مبشرہ وغیرھم کے بارے میں ہم جنتی ہونے کا یقین رکھتے ہیں، کیونکہ ان کی جنتی ہونے کی خبر خود حضور ﷺ نے دی ہے۔

بہرحال تکفیر کے مسئلہ میں احتیاط کی ضرورت ہے، حدیث پاک ہے: "من دعا رجلاً بالكفر او قال عدوّ الله وليس كذلك إلا حار عليه" (مسلم ج:۱، ص:۵۷) جس شخص نے کسی مسلمان پر کافر ہونے کا اتہام لگایا، اللہ کا دشمن کہا وہ خود کافر ہو گیا۔

حاصل یہ کہ مسلمان کو کافر کہنے والا خود کافر بن جاتا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ واقعی اور یقینی کافر کو کافر نہ کہا جائے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں: "فليس من الدين أن يغمض عن كافر كما ليس من الدين أن يكفر المسلم." (إكفار الملحدين: ۴۳)۔ قد اشتهر أن المؤوّل لا يكفر وهو على ظاهر إطلاقه غير صحيح، فإن المؤوّل في ضروريات الدين كافر كما صرح به الخيالي.

(معارف السنن ۱/۲۵۸)

ولا نرى السيف على أحد من أمة محمد ﷺ إلا من وجب عليه السيف.

ہم امت محمدیہ علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں سے کسی فرد پر تلوار چلانا جائز نہیں سمجھتے بجز جس پر تلوار کا چلنا واجب ہو جائے۔

لانرى السيف یعنی خون بہانا واجب نہیں سمجھتے۔ إلا من وجب عليه السيف: أي إلا على من وجب عليه السيف أي سفك الدم بالنص القاطع كالقاتل والزاني المحصن والمرتد. ففي البخاري ومسلم عن ابن مسعود رضي الله تعالىٰ عنه عن النبي ﷺ أنه قال: "لا يحل دم امرئ مسلم يشهد أن لا إله إلا الله وأني رسول الله إلا بإحدى ثلاث. الثيب الزاني، والنفس بالنفس والتارك لدينه المفارق للجماعة. دوسرے موقع پر ایک مؤمن کی جان کی قدر و قیمت دنیا سے بڑھ کر بتائی گئی ہے۔ فرمایا: "قتل المؤمن أعظم عند الله من زوال الدنيا". (نسائی، جمع الفوائد)

ولا نرى الخروج على أئمتنا وولاة أمورنا وإن جاروا ولا ندعو عليهم، ولا ننزع يدا من طاعتهم ونرى طاعتهم من طاعة الله عزوجل فريضة مالم يأمروا بمعصية وندعو لهم بالصلاح والمعافاة.

ہم اپنے ائمہ اور مسلمان حکمران کے خلاف خروج اور بغاوت کو جائز نہیں سمجھتے، اگر چہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں اور نہ ہی ہم انہیں بددعا دیتے ہیں اور نہ ہی ان کی اطاعت سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہیں، جب تک وہ کسی گناہ کا حکم نہ دیں ہم ان کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کا حصہ سمجھتے ہیں جو کہ فرض ہے اور ہم ان کے لئے ان کی نیت کی درستگی اور برائی سے بچنے کی دعا کرتے ہیں۔

کسی ضرورت کے بغیر حکام کی علی الاعلان اہانت شرعاً پسندیدہ نہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ: "لاتشغلوا قلوبكم لسب الملوك، ولكن تقربوا إلى الله تعالى بالدعاء لهم، يعطف الله قلوبهم عليكم."

اپنے ولی بادشاہوں کو برا بھلا کہنے میں مشغول نہ کرو، بلکہ ان کے حق میں دعاء کرکے اللہ تعالٰی کا تقرب حاصل کرو، اللہ تعالٰی ان کے دلوں کو تمہاری طرف متوجہ فرمادیں گے۔
(کنز العمال ۹، ۶۰)

بلاوجہ حکومت کی ہر بات میں کیڑے نکالنا اور اس کی کسی اچھائی کا اعتراف نہ کرنا ایسے ہی حکومت کی مخالفت کو بذات خود ایک مقصد بنالینا قطعاً درست نہیں۔ امام غزالیؒ نے اس ذہنیت کی تردید کی ہے کہ ہر مصیبت اور پریشانی پر حکمرانوں کو برا کہتے رہو اور ان کے خلاف تحریکیں چلاتے رہو اور یہ نہ دیکھو کہ خود تمہارا حال کیا ہے؟ یہاں تین باتیں ہیں۔ (۱) حکومت عادلہ کے خلاف بغاوت حرام ہے۔ (۲) اور اگر حکمران سے کفر بــــواح (واضح کفر) کا صدور ہو جائے تو اس کے خلاف بغاوت بالکل برحق ہے لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ خروج کے لئے مناسب قوت موجود ہو اور اس کے نتیجے میں کسی اور بدتر حکمران کے مسلط ہو جانے یا کسی غیر مسلم طاقت کے قبضہ جمالینے کا اندیشہ نہ ہو۔ (۳) اگر حکمران سے فسق وفجور (مثلاً زنا، شرب خمر، بندوں پر ظلم وزیادتی وغیرہ) سرزد ہو اور بندوں پر ظلم وزیادتی کرے پھر بھی ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرنی چاہئے ان کے خلاف بغاوت جائز اور مناسب نہیں، کیونکہ سلف نے ایسے حکمرانوں کی طاعت کی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حکمران کے معزول ہونے اور اس کی جگہ دوسرے امام کے تقرر کی صورت میں فتنہ کا اندیشہ ہے، جسے آسانی سے دبایا نہیں جاسکتا۔ الغرض فاسق حکمران کا حکم یہ ہے کہ اگر کسی طاعت کا حکم دے تو اس کی اطاعت کی جائے اور معصیت کا حکم دے تو اس کا ساتھ نہ دیا جائے۔ کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق" (رواہ احمد وحاکم)

ولاندعوا علیهم، حکمرانوں کے حق میں بددعا کی ضرورت نہیں، کبھی اللہ تعالٰی ہمارے برے اعمال کی وجہ سے ظالم حکمرانوں کو مسلط کردیتے ہیں، لہٰذا ارباب حکومت کو کوسنے کے بجائے اللہ کی طرف رجوع ہو۔ جب نادرشاہ نے دلی کو تاراج کیا اور دلی والوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے تو اس وقت کے عارف حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ نے فرمایا تھا: "شامت اعمال ما صورت نادر گرفت"

ونری طاعتہ علیہم یعنی ان کا حکم اگر خلاف شریعت نہیں ہے تو ہر حال میں ان کی اطاعت کی جائے گی لیکن گناہ میں کسی کی اطاعت نہیں۔

ونتبع السنة والجماعة ونجتنب الشذوذ والخلاف والفرقة.
ہم سنت اور جماعت کی پیروی کرتے ہیں اور مسلمانوں کی جماعت سے علیحدگی، مخالفت اور فرقہ بندی سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔

السنة: طريقة الرسول ﷺ والجماعة: جماعة المسلمين وهم الصحابة والتابعون

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "إن هذه الأمة ستفترق على ثلاث وسبعين ملة يعني الأهواء، كلها في النار إلا واحدة، وهي الجماعة." وفي رواية: "قالوا: من هي يا رسول الله؟" قال: "ما أنا عليه وأصحابي"

(الترمذی، رقم الحدیث ۲۶۴۱)

غرضیکہ اہل سنت والجماعت درحقیقت جماعۃ المسلمین اور اسلام کی اصل روح اور حقیقی تصویر ہے اور اسی نام کے ساتھ اسلام کی خدمت چودہ سو سال سے ہو رہی ہے مگر صد افسوس کہ جناب ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نے کئی سال قبل تاریخ کے علماء اور مسلمانوں سے علیحدگی اختیار کر کے صرف پاکستان کی سطح پر ایک فرقہ بنایا "جماعۃ المسلمین پاکستان" اور اپنے گروہ کے سوا ساری دنیا کے مسلمانوں کو غیر مسلم قرار دیا۔

ونحب أهل العدل والأمانة، ونبغض أهل الجور والخيانة
ہم اہل عدل و امانت سے محبت کرتے ہیں اور ظالموں اور خیانت کا ارتکاب کرنے والوں سے نفرت کرتے ہیں۔

ونحب ... : یہاں حسن محبت اور بغض کی وضاحت ہے۔

حدیث پاک ہے: "من أحب لله وأبغض لله وأعطى لله ومنع لله فقد استكمل الإيمان" (ابوداؤد) سے یہی ثابت ہے۔

ونقول: الله أعلم، فيما اشتبه علينا علمه.

اور کسی چیز کے بارے میں اگر شک وشبہ ہو جائے تو ہم اس مقام پر "اللہ اعلم" (اللہ بہتر جانتا ہے) کہتے ہیں۔

علامہ طحاویؒ کا کلام اس سے قبل بھی گزر چکا ہے، یعنی "انه ما سلم في دينه إلا من سلم لله عز وجل ولرسوله ﷺ، ورد علم ما اشتبه عليه إلى عالمه

وقد أمر الله نبيه ﷺ أن يرد علم ما لا يعلم إليه، فقال تعالى ﴿قل الله أعلم بما لبثوا له غيب السموات والأرض﴾ (الكهف ٢٦)

﴿قل ربي أعلم بعدتهم﴾ (الكهف ٢٢)

وقد قال صلى الله عليه وسلم لما سئل عن أطفال المشركين: "الله أعلم بما كانوا عاملين" (فتح الباري ١٣٨٤، مسلم ٢٦٥٩)

بہرحال جن چیزوں کا ہمیں علم نہیں ان کے بارے میں ہم کہہ دیا کریں "الله أعلم" یہی علماء محققین کا طریقہ ہے، عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: "إن من أفتى الناس في كل ما يسألونه عنه لمجنون" جو شخص ہر پوچھنے والے کے سوال کا جواب بے سمجھے دیتا ہے وہ پاگل ہے۔ (اعلام الموقعین ج ...)

ونرى المسح على الخفين في السفر والحضر كما جاء في الأثر

موزوں پر مسح ہم سفر وحضر میں جائز سمجھتے ہیں جیسے کہ آثار میں منقول ہے۔

"مسح علی الخفین" کے جواز پر اجماع ہے، کیونکہ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے تواتر کے ساتھ احادیث منقول ہیں۔ والرافضة تخالف هذه السنة المتواترة. روافض "مسح علی الخفین" کی بجائے مسح رجلین کے قائل ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ کا قول مروی ہے: قال: حدثني سبعون رجلاً من أصحاب النبي ﷺ أنه مسح على الخفين" (معارف السنن ج ۱ ص ۳۳۱)

وقال الكرخي: أخاف الكفر على من لم ير المسح على الخفين لأن الآثار جاءت فيه في حيز التواتر. وعن أبي حنيفة: ما قلت

حتى جاء نبي فيه مثل ضوء النهار، وروي عن أبي حنيفةؒ أنه سُئل عن مذهب أهل السنة والجماعة فقال: هو أن تفضّل الشيخين (أبو بكر وعمر) وأن تحب الختنين (عثمان وعلي) وأن ترى المسح على الخفين. (شرح الفقه) دراصل مسئلہ "مسح علی الخفین" کا تعلق تو علم فقہ سے ہے لیکن چونکہ روافض نے اس کا انکار کیا ہے اس لئے ان کے مقابلے میں اس مسئلہ کا اقرار اہل السنۃ والجماعۃ کی خاص علامت بن کر کتب عقائد میں مذکور ہوا۔ درمختار میں ہے کہ مسح علی الخفین کا ثبوت سنت مشہورہ سے ہے اور راوی حدیث مسح علی الخفین کے ۸۰ صحابہ سے زیادہ ہیں اوران میں عشرہ مبشرہ بھی ہیں۔ (الدرالمختار باب مسح علی الخفین)

> والحج والجهاد ماضيان، مع أولي الأمر من المسلمين، برّهم وفاجرهم إلى قيام الساعة، لا يُبطلهما شيء، ولا ينقضهما
>
> مسلمانوں میں سے نیک وبدحکمرانوں کے (یعنی انکی معیت میں) ساتھ حج اور جہاد قیامت تک جاری رہیں گے ان کو کوئی چیز نہ تو ختم کر سکتی ہے اور نہ توڑ سکتی ہے۔

يشير الشيخ إلى الرد على الرافضة، حيث قالوا: لا جهاد في سبيل الله حتى يخرج الرضا من آل محمد ﷺ، وينادي منادٍ من السماء: اتبعوه. مع أولي الأمر: أي مع الصحة مع أولي الأمر. برّهم: عادلهم فاجرهم: ظالمهم، لأن برّ الإمام ليس بشرط لصحتهما، ولأن الحج والجهاد فرضان يتعلقان بالسفر، فلابد من سائس يسوس الناس فيهما ويقاوم العدو، وهذا المعنى كما يحصل بالإمام البر يحصل بالإمام الفاجر

وقد كان السلف من الصحابة والتابعين يحجون ويجاهدون مع كل إمام برّ أو فاجر من غير نكير فكان ذلك إجماعًا

غرضیکہ حج اور جہاد دونوں میں انتظام کی ضرورت ہے اور انتظام جیسے امام عادل کی طرف سے ہو سکتا ہے، فاسق وفاجر بھی اس کا نظم ونسق کر سکتا ہے۔

کراماً کاتبین

> ونؤمن بالكرام الكاتبين، فإن الله قد جعلهم علينا حافظين۔
> ہم "کرام کاتبین" پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ بے شک انکو اللہ تعالیٰ نے ہمارا حافظ بنایا ہے۔

دراصل فرشتے دو قسم کے ہیں (۱) وہ فرشتے اللہ کے حکم سے ہر وقت انسان کی تاک میں لگے رہتے ہیں، جو لفظ اس کے منہ سے نکلے وہ لکھ لیتے ہیں: نیکی دائیں والا اور بدی بائیں والا۔ چنانچہ (سورہ ق آیت: ۱۷) ﴿إذ يتلقى المتلقيان عن اليمين وعن الشمال قعيد﴾ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ (۲) دوسری قسم وہ فرشتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ان بلاؤں کے دفع کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، جن سے حق تعالیٰ بندہ کو بچانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ (سورۃ رعد آیت: ۱۱) میں ارشاد ہے۔ ﴿له معقبات من بين يديه ومن خلفه يحفظونه من أمر الله﴾۔

ہر شخص کی حفاظت کے لئے کچھ فرشتے مقرر ہیں، جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے، کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ بحکم خداوندی بلاؤں سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

وفي الصحيح البخاري عن النبي ﷺ أنه قال: "يتعاقبون فيكم ملائكة بالليل وملائكة بالنهار، ويجتمعون في صلاة الصبح وصلاة العصر، فيصعد إليه الذين كانوا فيكم، فيسألهم، وهو أعلم بهم، كيف تركتم عبادي؟ فيقولون: أتيناهم وهم يصلون، وفارقناهم وهم يصلون۔ ترمذی کی روایت میں ہے: إن معكم من لا يفارقكم إلا عند الخلاء وعند الجماع فاستحيوهم وأكرموهم."

الحاصل یہ محافظ فرشتے دین ودنیا دونوں کی مصیبتوں اور آفتوں سے انسان کی سوتے جاگتے حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

ثم قد ثبت بالنصوص أن الملائكة تكتب القول والفعل، وكذلك النية، لأنها فعل القلب، فدخلت في عموم "يعلمون ما تفعلون".

ملک الموت

> وَنُؤمِنُ بِمَلَكِ الْمَوْتِ الْمُوَكَّلِ بِقَبْضِ أَرْوَاحِ الْعَالَمِينَ.
> ہم ملک الموت پر بھی ایمان رکھتے ہیں، جسے اللہ تعالیٰ نے روحیں قبض کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے۔

"ملک الموت" سے مراد عزرائیل علیہ السلام ہے لیکن ﴿الذین تتوفٰهم الملائكة﴾ اور ﴿حتى إذا جاء أحدكم الموت توفته رسلنا﴾ میں "ملائکۃ" اور "رسل" بلفظ جمع لایا گیا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام تنہا یہ کام انجام نہیں دیتے، بلکہ اعوان اور مددگار کی حیثیت سے ان کے ماتحت بہت سے فرشتے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ ﴿قل یتوفٰكم ملك الموت الذي وكل بكم﴾ میں اگرچہ ملک الموت واحد کا صیغہ ہے لیکن درحقیقت یہ واحد کا صیغہ نہیں، بلکہ اسم جنس ہے جو قلیل اور کثیر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے یا پھر یہ واحد ہی کا صیغہ ہے مگر قبض ارواح کی نسبت صرف ملک الموت (عزرائیل) کی طرف اس لئے ہے کہ وہی ذمہ دار اور امیر ہے اس طرح آیت میں تعارض نہیں رہے گا۔

امام تفسیر مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ساری دنیا ملک الموت کے سامنے ایسی ہے جیسے کہ انسان کے سامنے ایک کھلے طشت میں دانے پڑے ہوں وہ جس کو چاہے اٹھالے، یہ مضمون ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے، "ذكره القرطبي في التذكرة" (بحوالہ معارف القرآن: ۷/۸۶)

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے کے ذریعے قبض روح انسان کے لئے مخصوص ہے ان کی شرافت وکرامت کے لئے، دیگر جانور باذن خداوندی بغیر واسطہ فرشتے کے مر جائیں گے۔

نیز خود ملک الموت کسی کی موت کا وقت پہلے سے نہیں جانتا جب تک کہ اس کو حکم نہ دیا جائے کہ فلاں کی روح قبض کرلو۔ (اخرجہ احمد وابن ابی الدنیا عن معمر بن...)

عذاب قبر

وبعذاب القبر لمن كان له أهلاً.
اور جو شخص قبر کے عذاب کا مستحق ہو اس کے لئے عذاب فی القبر پر ہم یقین رکھتے ہیں۔

وبعذاب القبر: اي نؤمن بعذاب القبر۔ یہ "بملک الموت" پر عطف ہے۔ "لمن كان له أهلاً" قبر کے عذاب کے مستحق اہل تمام کفار ہیں اور بعض گناہ گار اہل ایمان بھی مستحق ہیں مگر بعض دیگر گناہ گار مومنین کو قبر میں عذاب نہیں ہوگا۔ مثلاً شہید کے بارے میں روایت ہے: "ويجار من عذاب القبر" شہید کو عذاب سے محفوظ کردیا جاتا ہے۔ (ترمذی)۔ جہاد کے سلسلے میں پہرہ داری کرنے والے کے بارے میں روایت ہے۔ "ومن مات فيه وقي فتنة القبر" جو پہرہ داری کے دوران مرجائے اسے فتنہ قبر سے نجات دے دی جائے گی۔ ترمذی کی ایک اور روایت ہے "من قتله بطنه لم يعذب في قبره" جو پیٹ کی بیماری سے مرگیا اسے عذاب قبر نہیں ہوگا۔ بروایت سورۃ ملک پڑھنے والا عذاب قبر سے محفوظ ہوگا (نسائی)۔ ماہ رمضان میں مسلمان عاصی وفات پاجائے تو اس کو قیامت تک عذاب قبر سے امن ہوجاتا ہے ایسے ہی جو مسلمان عاصی جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات مرجائے اس کا عذاب قبر معاف ہے۔ (شامی، اقرب الجنائز)

عذاب قبر کے سلسلے میں چار امور قابل ذکر ہیں۔

(۱) جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک عذاب و تنعیم کا تعلق جسد مع الروح سے ہے۔ روح چاہے ساتویں آسمان کے اوپر علیین میں ہو مگر اس کا تعلق بدن عنصری کے ساتھ اس طرح ہوگا جس طرح آسمان سے سورج کی شعاع زمین پر پڑتی ہے، روح کے اس تعلق سے مردہ جسم میں "نوع من الحياة" پیدا ہوتی ہے جس سے عذاب وثواب کا ادراک کرسکے لیکن روح کا یہ تعلق تدبیر و تصرف کا نہیں ہے، وہ تو دنیا میں تھا اور ختم ہوگیا۔ ایسا تعلق دوبارہ صرف آخرت میں ہوگا، عالم برزخ میں روح کا تعلق ایسا نہیں ہوگا جیسے دنیا

میں تھا۔ بلکہ اس تعلق سے ایک خاص قسم کی حیات اتنی مقدار میں آ جائے گی جس سے عذاب وثواب کا ادراک کر سکے۔ فان عود الروح الی الجسد لیس علی الوجه المعهود فی الدنیا، بل تعاد الروح الیه اعادة غیر اعادة المألوفة فی الدنیا.

(شرح عقیدۃ الطحاویۃ: ص ۴۰۰)

(۲) مردہ کا جسم جب حفرۃ (گڑھے) میں رکھ جاتا ہے تب تو اشکال نہیں۔ کیونکہ عذاب وثواب کا معاملہ اسی جگہ ہوگا، جہاں جسم رکھا گیا ہے، یعنی مدفن ارضی میں اور یہی عام ہے، لیکن بعض دفعہ کچھ شاذ و نادر صورتیں بھی پیش آتی ہیں، جیسے دریا میں غرق شدہ شخص اور وہ شخص جس کو درندے کھا گئے ہوں اور جس کو ہوا میں پھانسی چڑھا دیا گیا ہو اور جس کے جسم کو جلا کر راکھ کر دیا گیا ہو، اور کبھی جسم کے اجزاء خاک میں مل جاتے ہیں پھر بھی ان سب کو عذاب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ جسم کے کل یا بعض اجزاء منتشرہ سے روح کا تعلق قائم کر کے ان میں نوع من الحیات پیدا کر کے دردِ لذت، دکھ اور سکھ کا شعور ان اجزاء میں پیدا کر دے یہ بات قادر مطلق پر نہ مشکل ہے اور نہ ممتنع ہے۔ غرضیکہ ہر کسی کو دنیا کے بعد اور آخرت سے پہلے درمیانی وقفے یعنی عالم برزخ سے واسطہ پڑے گا خواہ وہ قبر میں ہو یا کسی اور جگہ ہو۔

(۳) رہی یہ بات کہ ہمیں تو میت کے جسم پر کوئی معاملہ (عذاب و تکلیف کا) ہوتا نظر نہیں آتا تو محض یہ شبہ انکار عذاب قبر و تنعیم قبر کا باعث نہیں بن سکتا، کیونکہ کسی شی کی عدم رؤیت، عدم وجود کی دلیل نہیں ہوتی، جنات، فرشتے اور ہوا بھی کسی کو نظر نہیں آتی مگر ایک حقیقت ہے خواب دیکھنے والا خواب میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو کر سخت عذاب میں بے چین ہوتا ہے مگر پاس بیٹھنے والوں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی، اسی طرح عذاب قبر کے باخفاء عن الناس میں بھی حکمتیں ہیں، ایک عالم (عالم برزخ وقبر) کو دوسرے عالم (عالم دنیا) پر قیاس کرنا غلط ہے لہٰذا عالم برزخ وقبر کے علم کا ذریعہ صرف اور صرف وحی الٰہی ہے۔

(۴) خوارج، بعض مرجئہ اور بعض معتزلہ کے علاوہ موجودہ زمانے کے آزاد خیال اور منکرین حدیث نے بھی عذاب قبر کا بالکلیہ انکار کیا ہے اس سلسلے میں وہ کچھ شبہات

پیش کرتے ہیں، وہ قبر کی تفصیل سے وہ شبہات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔

محمد بن جریر کرامی اور عبد اللہ بن کرام اور ابو الحسن صالحی وغیرہ کے نزدیک عذاب صرف جسم سے بیان پر ہوتا ہے، لیکن جب جسم میں کسی قسم کی بھی حیات نہ ہو، اس پر عذاب ماننا کیا ممکن ہے؟

ابن حزم ظاہری اور ابن میسرہ صرف اور صرف روح پر عذاب و ثواب مانتے ہیں، لیکن جمہور اہل سنت کے مذہب کی تفصیل گزر چکی ہے۔

وسؤال منكر ونكير في قبره عن ربه ودينه ونبيه. ہم قبر میں منکر نکیر کے سوالات کو بھی یقین کے ساتھ مانتے ہیں جو سوالات وہ اللہ کی ذات، دین اور نبی اکرم ﷺ کے بارے میں پوچھیں گے۔

یہاں تین باتیں ہیں: (۱) منکر: بفتح الكاف، كما في القاموس، اسم مفعول من أنكره إذا لم يعرفه. نكير: فعيل بمعنى مفعول من نكر بالكسر كلاهما ضد المعروف، سميا بذلك لأن الميت لم يعرفهما ولم ير صورة مثل صورتهما. (مرقاة شرح مشكوة) كأن النكير أبهب من المنكر حيث سمي بالمصدر (عصام) یعنی "نکیر" "منکر" کے مقابلہ میں زیادہ وحشت والا ہے۔ ابن حجر نے لکھا ہے کہ منکر نکیر گناہگاروں کے لئے ہیں، اور مبشر بشیر فرمانبرداروں کے لئے ہیں۔
(فتح الباری: ۳/۲۳۹)

بہرحال منکر اور نکیر دو فرشتے ہیں جو قبر میں ہر بندے سے آکر رب، دین اور نبی کے بارے میں سوال کریں گے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "إذا قبر الميت أتاه ملكان أسودان أزرقان يقال لأحدهما المنكر وللآخر النكير" أزرقان: بتقديم الزاء المعجمة على الراء المهملة. ازرق کا واحد الازرق ہے، یعنی آسمانی رنگ، نیلی آنکھ۔ منکر و نکیر کی اس مخصوص شکل کی بنا پر کفار اور منافقین پر وحشت اور رعب پڑے گا، مگر اہل ایمان کو اللہ حوصلہ اور استقامت نصیب فرمائیں گے۔ (مرقاۃ شرح مشکوۃ)

(۲) بعض نے کہا ہے کہ: مردوں سے سوال کرنے والے فرشتے بہت سے ہیں جن میں بعض کا نام منکر اور بعض کا نام نکیر ہے۔ سوال کے لئے بہت سے ہیں پس ان میں سے دو فرشتوں کی تخصیص کی ہوئی ہے، جس طرح ہر شخص کے کاتب اعمال فرشتے ہیں۔

(۳) راجح یہ ہے کہ نابالغ مسلم بچے چونکہ غیر مکلف ہیں، اس لئے ان سے نہ تو سوال ہوگا اور نہ ہی ان پر عذاب قبر ہوگا جیسے کہ انبیاء علیہم السلام سے سوال نہ ہوگا کیونکہ جب امت کے بعض صلحاء سے از روئے حدیث سوال نہ ہوگا تو انبیاء سے بدرجہ اولیٰ نہ ہوگا۔ کفار کے بچوں کے بارے میں علماء کرام نے توقف کیا ہے۔

(۴) بقول العلماء: فإن ظهر عن الميت أثر الإسلام سأل عنه المنكر وإن ظهر عنه الكفر سأل عنه النكير.

على ما جاءت به الأخبار عن رسول الله ﷺ وعن الصحابة رضوان الله عليهم.

جس طرح کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام ؓ سے اس کے بارے میں احادیث آئی ہیں۔

مرنے اور دفن ہونے کے بعد فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم ﷺ کی ستر احادیث متواترہ میں بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے۔ (ابن کثیر، شرح الصدور) یہی وجہ ہے کہ بہت سے فقہاء اور متکلمین نے منکرین عذاب قبر کی تکفیر کی ہے، البتہ فقہاء اس کی تکفیر میں بہت احتیاط کرتے ہیں۔

نوٹ: واضح رہے کہ عذاب قبر کی کیفیت کو متعین کرنا دشوار ہے، لیکن قطعی نصوص اس کی کوئی صورت متعین کرتی ہیں جس کے انکار کرنے والے کو کافر کہا جائے، اس لئے بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ عذاب قبر حق ہے اور اس پر ایمان لانا فرض ہے لیکن اس کی حقیقت اور کیفیت کا علم اللہ ہی کو بہتر ہوتا ہے۔ (ترجمہ از [illegible])

فائدہ: عذاب قبر کے بارے میں احادیث تواتر لفظی کے قبیل سے نہیں، بلکہ یہ احادیث معنی کے اعتبار سے متواتر ہیں، اگرچہ ان کی جزئیات اور احاد درجہ تواتر تک نہیں پہنچیں، مگر یہ سب احاد امر مشترک (عذاب قبر) پر متفق ہیں۔ یہ تواتر معنوی کہلاتا ہے، متواتر معنوی بھی تواتر لفظی کی طرح قطعی حجت ہے، جو عقیدہ کے اثبات کے لئے کافی ہے۔

والقبرُ روضةٌ من رياض الجنة أو حفرةٌ من حفر النيران.

قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

یہ دراصل ترمذی کی حدیث ہے، جس کو طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اقتباس کیا ہے، اس حدیث میں عذاب قبر کے ساتھ ساتھ خاص کر تنعیم قبر کا بھی ذکر ہے۔

نیران: بالكسر جمع نار وآورده بلفظ الجمع بخلاف الجنة تهويلا.

یعنی جمع کا صیغہ جہنم کی ہولناکی کی خاطر استعمال ہوا ہے۔

ونؤمن بالبعث وجزاء الأعمال يوم القيامة والعرض والحساب وقراءة الكتاب والثواب والعقاب والصراط والميزان.

ہم موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے، قیامت کے روز اعمال کی جزاء، پیشی، حساب و کتاب، اعمال نامے کی قراءت، ثواب، عقاب، پل صراط اور میزان جیسے حقائق پر ایمان رکھتے ہیں۔

بعث کی تعریف

تعریف سے قبل بطور مقدمہ کے یہ سمجھئے کہ اجزاء انسانی کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) اجزاء اصلیہ: کھانا کھانے سے پہلے انسان میں موجود اجزاء، جو ابتداء عمر سے لیکر آخر تک باقی رہتے ہیں۔ (۲) اجزاء فضلیہ، وہ زائد اجزاء جو کھانا کھانے کے بعد غذا سے حاصل

ہوں۔ بعث کی تعریف یہ ہے کہ "البعث: ان یبعث اللہ تعالیٰ الموتیٰ من القبور" یعنی جزا و سزا کے لئے اللہ تعالیٰ کا مردوں کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا بعث کہلاتا ہے جس کی کیفیت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ جسم کے اجزاء اصلیہ کو جمع فرما کر دنیا میں جو روح اس جسم سے متعلق تھی وہ روح اس جسم کی طرف لوٹا دیں گے، اس موقع پر روح کا رشتہ اور تعلق بدن سے سو درجہ مضبوط ہوگا، کیونکہ اس کے بعد بدن کو فساد، موت اور نیند بھی نہیں آسکتی۔

عاص بن وائل یا ابی ابن خلف کافر جب اپنے ہاتھ میں بوسیدہ ہڈیاں لیکر آیا اور حضور ﷺ کے سامنے کہنے لگا: ﴿من یحیی العظام وهی رمیم﴾ بھلا ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندگی دے گا۔ (نعوذ باللہ) تو اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ﴿قل یحییها الذی انشاها اول مرة﴾ اے نبی ﷺ کہہ دیجئے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو وہ اللہ زندہ کرے گا جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا، اور اسی طرح کی بے شمار آیات اور احادیث ہیں جو صاف اور صریح لفظوں میں بعث بعد الموت کی خبر دیتی ہے۔

وجزاء الاعمال یوم القیامة: قیامت کے روز اعمال کی جزا پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ جیسے ارشاد ہے ﴿الیوم تجزی کل نفس بما کسبت لا ظلم الیوم ان اللہ سریع الحساب﴾ [مؤمن: ۱۷]

آج ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا، آج کسی پر ظلم نہ ہوگا۔ اللہ بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔ جیسے سورۃ الواقعہ میں ہے ﴿جزاء بما کانوا یعملون﴾ [الواقعۃ: ۲۴]

والعرض: پیشی پر بھی ہم ایمان رکھتے ہیں۔ والحساب: حساب و کتاب پر ہم یقین رکھتے ہیں۔ بعض کا حساب ہوگا اور کسی کا فقط عرض ہوگا۔ عرض کا مطلب حساب یسیر ہے، چنانچہ بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "من حوسب یوم القیامة عذب" یعنی قیامت کے روز جس سے حساب لیا جائے وہ عذاب سے نہ بچے گا۔ اس پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ کیا قرآن میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں ہے: ﴿فسوف یحاسب حسابا یسیرا﴾ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس

آیت میں جس کو "الحساب یسیر" فرمایا وہ درحقیقت مکمل حساب نہیں، بلکہ صرف رب العزت کے سامنے "عرض" پیشی ہے اور جس شخص سے اس کے اعمال کا پورا پورا حساب لیا گیا وہ ہرگز عذاب سے نہ بچے گا۔ معلوم ہوا کہ مؤمنین کے اعمال بھی رب العزت کے سامنے پیش تو سب ہوں گے مگر ان کے ایمان کی برکت سے ان کے ہر عمل پر مناقشہ نہیں ہوگا، اسی کا نام "حساب یسیر" ہے۔

• وقراءۃ الکتاب: اعمال نامے کے پڑھنے پر ہم ایمان رکھتے ہیں، اعمال نامہ وہ لکھی ہوئی کتاب ہے، جس میں بندوں کی طاعات اور ان کے معاصی درج ہوں گے، اہل ایمان کا اعمال نامہ سامنے سے داہنے ہاتھ میں اور کفار کا پیچھے سے بائیں ہاتھ میں دیا جائیگا، جس کو وہ پڑھیں گے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ﴿ونخرج له يوم القيامة كتابا منشورا اقرا كتابك كفى بنفسك اليوم حسيبا﴾ [بنی اسرائیل: ۱۴] یعنی قیامت کے دن اس انسان کا اعمال نامہ اس کے دیکھنے کے لئے نکال کر سامنے کر دیں گے جس کو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا اور اس سے کہا جائیگا کہ اپنا اعمال نامہ خود پڑھ لے آج تو خود ہی اپنا حساب جانچنے کے لئے کافی ہے، اصحاب یمین بڑے سرور وانبساط سے اپنا اعمال نامہ پڑھیں گے، اور دوسروں کو کہیں گے ﴿هاؤم اقرءوا كتابيه﴾ [الحاقۃ: ۱۹] کہ آؤ میری کتاب پڑھ لو، باقی اصحاب شمال کو جب پیٹھ کے پیچھے سے بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ پکڑایا جائے گا۔ ﴿فسوف يدعوا ثبورا﴾ [الانشقاق: ۱۱] عذاب کے ڈر سے پکارے گا موت۔ موت۔

والثواب والعقاب: ثواب اور عقاب پر ایمان رکھتے ہیں، الثواب والعقوبۃ، اعمال کا بدلہ خیر ہو یا شر، عموماً خیر کے لئے مستعمل ہے۔ عاقبۃ وعقاباً، فعاقبۃ بذنبہ وعلى ذنبہ "مواخذہ کرنا"، دینا اسم "العقوبۃ"۔ اعمال خیر پر ثواب اور اعمال بد پر عقاب کے سلسلے میں قرآن وحدیث کی بہت سی آیات وروایات وارد ہیں۔ والصراط: پل صراط پر بھی ہم ایمان رکھتے ہیں، جہنم کی پشت پر ایک پل

ہوگا جس کے اوپر سے سب لوگوں نے گزرنا ہے۔ کما قال تعالیٰ ﴿وان منکم إلا واردها﴾ [مریم: ۷۱] صحیح اور راجح قول کے مطابق "ورود" سے مراد "مرور علی الصراط" ہے۔

قال ابو سعید الخدری الصحابي رضي الله عنه: "بلغني أن الجسر أدق من الشعر وأحد من السيف" (رواه مسلم بعد ان ذكر المرفوع) یعنی یہ پل بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان میں سے بعض پل صراط پلک جھپکنے میں عبور کر لیں گے اور بعض اہل ایمان اچکنے والی بجلی کی طرح، بعض ہوا کی طرح گزر جائیں گے، بعض تیز ہوا کی طرح، بعض پرندوں کی طرح گزر جائیں گے، بعض تیز رفتار گھوڑے کی طرح گزریں گے اور بعض پیدل کی رفتار سے عبور کریں گے۔ الغرض اہل ایمان حسب درجات اس کو عبور کر کے جنت میں پہنچ جائیں گے اور جہنمی لوگ کٹ کر نیچے گر جائیں گے۔

والميزان: أي نؤمن بالميزان۔ میزان سے مراد وہ شیٔ ہے جس کے ذریعے اعمال تولے جائیں گے، جمہور کا مسلک یہ ہے کہ میزان ایک ہی ہے "ونضع الموازين" میں جو جمع کا صیغہ ہے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ بہت سے موازین کا کام دے گی، قیامت تک سب کے اعمال کو یہی ترازو تولے گی۔ جمہور کے قول کے مطابق وزن اعمال کی صورت یہ ہوگی کہ ان اعمال کو وہاں جواہر مستقلہ (جسم) کی شکل دے دی جائے گی اور ان کا وزن کیا جائے گا یا اعمال اعراض ہونے کے باوجود تولے جائیں گے، کیونکہ جب درجہ حرارت، گاڑی کی رفتار، بجلی، گیس اور بخار وغیرہ آلات سے تولے اور ناپے جا سکتے ہیں تو اعمال کیوں نہیں تولے جا سکتے؟

والجنة والنار مخلوقتان

جنت اور دوزخ اللہ کی مخلوق ہیں۔

جنت اور جہنم دونوں برحق ہیں دونوں کے ثبوت پر بے شمار آیات واحادیث ہیں، معتزلہ کا خیال تو یہ ہے کہ جنت اور جہنم ابھی موجود نہیں ہیں بلکہ قیامت کے دن پیدا کی جائیں گی معتزلہ چونکہ عقل کے پجاری ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ جزاء سے پہلے جنت جہنم کی تخلیق بلا وجہ ہے، کیونکہ اس طرح تو جنت اور جہنم ایک طویل عرصہ کے لئے معطل ہو جائیں گی لیکن اہل سنت کے نزدیک جنت اور جہنم پیدا کی جا چکی ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں اس لئے کہ (۱) آدم اور حوا علیہما السلام کا قصہ قرآن میں موجود ہے وہ دونوں جو کہ جنت میں رہائش دی گئی تھی اس سے مراد یہی معروف جنت ہے۔ (۲) نصوص قرآنیہ میں جنت و جہنم کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ جیسے یہ تیار ہو چکی ہیں جیسے ﴿أعدت للمتقين﴾ [آل عمران ۱۳۳]

﴿أعدت للذين آمنوا بالله ورسله﴾ [الحديد ۲۱]

﴿أعدت للكافرين﴾ [آل عمران ۱۳۱]

لا تفنيان أبداً ولا تبيدان

جنت اور دوزخ کبھی فنا نہیں ہوں گی نہ ان پر ہلاکت آئے گی۔

(مقالات کوثری ص ۴۰۲) پر "مسألة الخلود" کے عنوان کے تحت علامہ کوثری لکھتے ہیں: "دوام نعيم أهل الجنة واستمرار عذاب أهل الجحيم مما علم من الدين بالضرورة وقد تواردت الأدلة على بقاء الجنة والنار، ومضت الأمة على هذه العقيدة مدى العصور" یعنی قرآن کریم کی متعدد آیات سے جنت کا ہمیشہ باقی رہنا ثابت ہے۔ لیکن جہم بن صفوان جنت اور جہنم کے فناء کا قائل ہے، حالانکہ یہ جماعت المسلمین کے خلاف ہے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جنت اور جہنم کی بیچ میں موت ذبح کر دی جائے گی اور کہا جائے گا "يا أهل الجنة خلود فلا موت، ويا أهل النار خلود فلا موت"

فإن الله تعالیٰ خلق الجنة و النار قبل الخلق و خلق لهما أهلاً۔
اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ کو دوسری مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے بنایا اور
ان کے لئے اہلیت رکھنے والے لوگ بنائے۔

دلیل اس دعویٰ کی یہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ولقد ذرأنا لجهنم كثيرا من الجن والانس﴾ [اعراف ۱۷۹] اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ ہی میں رہنے کے لئے پیدا کئے ہیں۔ مسلم اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ "إن الله خلق للجنة أهلاً، خلقهم وهم في أصلاب آبائهم و خلق للنار أهلاً، خلقهم لها وهم في أصلاب آبائهم" اللہ تعالیٰ نے جنت اور جہنم کے لئے اہل پیدا کئے درآں حالیکہ وہ ابھی باپ کی پیٹھ میں تھے۔

فمن شاء منهم إلى الجنة أدخله فضلاً منه ومن شاء منهم إلى النار أدخله عدلاً منه.
ان میں سے جسے چاہے گا اپنے فضل و کرم سے جنت میں داخل کرے گا اور
جسے چاہے گا اپنے عدل و انصاف کے ساتھ جہنم رسید کرے گا۔

اس کا حاصل یہ نکلا "كل عطاء منه فضل و كل عقوبة منه عدل" یعنی اللہ کے ہاں ظلم نہیں اگر عطا کرے تو یہ اس کا فضل ہے اور اگر عذاب میں مبتلا کرے تو یہ اس کا عدل ہے۔

وكلٌ يعمل لما قد فُرغ له و صائرٌ لما خُلق له والخير والشرُّ مقدَّران على العباد.
ہر انسان وہی کام سرانجام دیتا ہے جس کے لئے اسے فراغت دی گئی اور ہر
شخص اسی طرف لوٹنے والا ہے جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا۔ خیر و شر کا بندوں
کے لئے فیصلہ کر دیا گیا ہے۔

ایک نسخہ میں "کل یعمل لما قد فرغ منه" کے الفاظ ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہر شخص عمل کر رہا ہے اس چیز کے لئے جس سے فراغت ہو چکی ہے۔ حاصل یہ کہ جس کے لئے جو مقدر ہے وہ ہو کر رہے گا۔

والاستطاعة التي بها الفعل، من نحو التوفيق الذي لا يوصف المخلوق به تكون مع الفعل. وأما الاستطاعة من جهة الصحة، والوسع، والتمكين، وسلامة الآلات، فهي قبل الفعل، وبها يتعلق الخطاب، وهو كما قال تعالى: ﴿لا يكلف الله نفسا إلا وسعها﴾ [البقرة ۲۸۶]

اور وہ استطاعت جس کی وجہ سے فعل واجب ہوتا ہے جیسے توفیق ہے، جس سے مخلوق کا متصف ہونا ممکن نہیں تو یہ استطاعت فعل کے ساتھ ہوتی ہے، اور وہ استطاعت جو صحت، وسعت، قدرت اور آلات کی سلامتی کے اعتبار سے ہے، اس کا وجود فعل سے پہلے ہوتا ہے اور خطاب (حکم) اسی استطاعت سے متعلق ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے "اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

استطاعت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک قدرت حقیقی، جو استطاعت کا حقیقی معنی ہے۔ دوم اسباب وآلات کا سالم ہونا اور اعضاء کا صحیح ہونا، یہ استطاعت کا مجازی معنی ہے۔ (۱) قدرت حقیقیہ: قدرت حقیقیہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے۔ یہ قدرت حقیقیہ فعل کا مقارن یعنی ہم زمان ہے، پہلے سے بندہ کے اندر فعل کی قدرت نہیں ہوتی، بلکہ جب وہ فعل کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس فعل کی قدرت پیدا فرما دیتے ہیں جس کے ساتھ ہی فعل موجود ہو جاتا ہے۔ یہ قدرت حقیقیہ فعل کے لئے علت بھی ہوتی ہے۔ (۲) استطاعت بمعنی سلامت اسباب وآلات وصحت اعضاء یہ فعل سے مقدم ہوتی ہے۔

والحاصل أن القدرة لها إطلاقان فتطلق تارة ويراد بها حقيقة القدرة وهي مع الفعل، وتطلق أخرى ويراد بها الوسع والسلامة وهي قبل الفعل.

انسان کو مکلف کرنے کا مدار قدرت حقیقیہ پر نہیں ہوتا، بلکہ قدرت بمعنی سلامت اسباب پر ہوتا ہے (جس کی طرف آیت کریمہ میں اشارہ ہے) کیونکہ جو قدرت مدار تکلیف ہوتی ہے وہ فعل پر مقدم ہوتی ہے لہذا استطاعت بمعنی سلامت اسباب ہی مدار تکلیف ہوگی۔

افعال العباد

> وافعال العباد هي بخلق الله تعالىٰ وكسب من العباد.
>
> بندوں کے افعال اور کام اللہ کی مخلوق اور بندوں کا کسب دکمائی ہیں۔

خلق اور کسب کا فرق

الخلق فعل الله وهو إحداث الاستطاعة في العبد واستعمال الاستطاعة المحدثة فعل العبد.

یعنی بندہ میں استطاعت اور عمل کی طاقت پیدا کرنا خلق ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ اور استطاعت حادثہ یعنی اللہ نے بندہ کو عمل کرنے کی جو قوت اور قدرت عطاء کی ہے اس قوت اور قدرت کو استعمال کرنا کسب ہے اور یہ بندہ کا فعل ہے۔

افعال عباد کی دو قسمیں ہیں (۱) افعال اضطراریہ: جو بندہ سے اس کے ارادہ واختیار کے بغیر صادر ہوتے ہیں۔ جیسے "العروق النابضة" (دھڑکتی رگیں) درختوں کی حرکت اور حرکت مرتعش (اس شخص کی حرکت جیسے رعشہ کا عارضہ ہو) اس طرح کی افعال بالاتفاق اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ (۲) افعال اختیاریہ: مثلاً کفر وایمان، طاعت اور معصیت وغیرہ، یہیں محل اختلاف ہیں، جبریہ ان افعال کے بارے میں بندہ کو مجبور محض مانتے ہیں اور معتزلہ کہتے ہیں کہ بندہ خود ان افعال کا موجد اور خالق ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کو کوئی دخل نہیں اور اہل سنت والجماعت نہ تو جبریہ کی طرح بندہ کا مجبور محض مانتے ہیں

کہ اس کی قدرت واختیار کا کوئی دخل نہ ہو اور نہ معتزلہ کی طرح اللہ تعالیٰ کو بالکل بے دخل مانتے ہیں، بلکہ کہتے ہیں کہ: بندوں کے افعال اختیاریہ بندہ اور اللہ دونوں کی قدرت سے وجود میں آتے ہیں۔ بندہ کی قدرت کا تعلق کسب سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا تعلق خلق سے ہے، یعنی بندہ کاسب ہے اور اللہ خالق ہے۔ اہل سنت کی دلیل متعدد نصوص ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿واللّٰہ خلقکم وما تعملون﴾ [الصافات: ۹۶] اللہ خالق ہے تمہارا اور تمہارے اعمال کا بھی۔ ما مصدریہ ہے، "أی و اللّٰہ خلقکم وعملکم" دوسری جگہ فرمایا: ﴿لا إلٰہ إلا ھو خالق کل شيء فاعبدوہ﴾ [الأنعام: ۱۰۲] جب اللہ تعالیٰ ہر شی کا خالق ہے اور افعال عباد بھی شی ہیں لہٰذا افعال عباد کا بھی خالق وہی ہوگا۔

ولم یکلفھم اللّٰہ تعالیٰ إلا ما یُطیقون.
اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو انہیں کاموں کا حکم دیا ہے جن کی وہ طاقت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بندہ کو "ما لا یطاق" (ایسے کام کا کرنا بندہ کی قدرت اور بس میں نہیں) کا مکلف نہیں بنایا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی طاقت کے بقدر مکلف بنایا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿لا یکلف اللّٰہ نفسا إلا وسعھا﴾ [البقرۃ: ۲۸۶]

اب یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک ہے تکلیف اور دوسری ہے تعجیز، دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ تکلیف میں آمر کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ شخص مامور سے فعل مامور بہ کا وجود ہو اور تعجیز میں آمر کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ شخص مامور سے فعل مامور بہ انجام نہ پاسکے، تاکہ اس کا عاجز ہونا ظاہر ہو جائے، جیسا کہ قیامت کے روز مصورین کو اپنی بنائی ہوئی صورتوں کو زندہ کرنے کا امر "أحیوا ما خلقتم" تعجیز کے لئے ہوگا۔

ولا یطیقون إلا ما کلّفھم وھو تفسیر لاحول ولا قوۃ إلا باللّٰہ نقول: لاحیلۃ لأحد ولاحرکۃ لأحد ولاتحول لأحد عن معصیۃ اللّٰہ إلا بمعونۃ اللّٰہ ولا قوۃ لأحد علی إقامۃ طاعۃ اللّٰہ والثبات علیھما إلا بتوفیق اللّٰہ.
اور وہ طاقت نہیں رکھتے ہیں مگر جس کے وہ مکلف ہیں "لاحول ولاقوۃ" کے مفہوم

کا حاصل بھی یہی ہے، ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کائنات میں کسی کا کوئی بس نہیں چلتا نہ کوئی چیز اس کے حکم کے بغیر حرکت کر سکتی ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر بندہ کوئی اس کی نافرمانی سے بچ سکتا ہے اور نہ اللہ کی اطاعت کے ادا کرنے پر کسی کو کوئی قوت ہے اور نہ طاعت پر ثابت قدم رہنے کی طاقت ہے، مگر اللہ کی توفیق سے۔

طاقت سے مراد توفیق خداوندی ہے، اسباب و آلات کا سالم ہونا مراد نہیں ہے،

یہاں امام طحاویؒ کی عبارت پر تھوڑا اشکال ہے، کیونکہ ان کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جن امور (امر و نہی وغیرہ) کا مکلف بنایا ہے، بندے ان سے زیادہ کی طاقت نہیں رکھتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بندوں کو جن امور کا مکلف بنا دیا گیا ہے وہ ان سے کہیں بڑھ کر زیادہ مشکل کی بھی طاقت رکھتے ہیں، مگر یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اپنے بندوں کے ساتھ آسانی اور تخفیف کا ارادہ کرتے ہیں، تنگی کا نہیں، اس لئے ان کو زیادہ مشکل کا مکلف نہیں بنایا، جیسے ارشاد ہے: ﴿يريد الله بكم اليسر ولا يريد بكم العسر﴾ [البقرة: ۱۸۵]

"لا حول ولا قوة إلا بالله" سے مصنف کی غرض اثبات تقدیر کی دلیل کو پیش کرنا ہے اور آگے پھر خود اس کی تشریح موجود ہے۔

وكل شيء يجري بمشيئة الله تعالى وعلمه وقضائه وقدره، غلبت مشيئته المشيئات كلها وغلب قضاؤه الحيل كلها، يفعل ما يشاء وهو غير ظالم أبدًا "لا يسأل عما يفعل وهم يسألون".

کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مشیئت، اس کے علم اور قضاء و قدرت سے جاری ہے اس کی مشیئت اور مرضی تمام مشیئتوں پر غالب ہے اور اس کا فیصلہ تمام حیلوں اور تدبیروں پر غالب ہے جو وہ چاہتا ہے کرتا ہے وہ ذات کسی پر ظلم نہیں کرتی وہ جو کام کرتا ہے اس سے پوچھا نہ جائے گا (اور جو یہ لوگ کرتے ہیں) ان سے پوچھا جائے گا۔

ارادہ اور مشیئت دونوں کا ایک ہی معنی ہے اور ایک ہی صفت سے یہ دونوں

ضرورت ہیں۔

قضا کی دو قسمیں ہیں (۱) قضاءِ تکوینی: جیسے ارشاد ہے: ﴿فقضاهن سبع سموات في يومين﴾ [فصلت: ۱۲] یعنی دو دن میں اللہ نے آسمان بنائے۔ (۲) قضاءِ شرعی: جیسے ارشاد ہے: ﴿وقضى ربك ألا تعبدوا إلا إياه﴾ [الإسراء: ۲۳] یعنی حکم کر دیا تیرے رب نے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہاں قضاء سے قضاءِ تکوینی مراد ہے قضاءِ شرعی مراد نہیں۔

"وهو غير ظالم أبدا" یعنی اللہ تعالیٰ کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ قرآن کی بہت ساری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو بندوں کے ظلم سے منزہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿ولا يظلم ربك أحدا﴾ [الكهف: ۴۹] ﴿وما أنا بظلام للعبيد﴾ [ق: ۲۹] ﴿وما ظلمناهم ولكن كانوا هم الظالمين﴾ [الزخرف: ۷۶]

حدیث قدسی ہے: "يا عبادي إني حرمت الظلم على نفسي وجعلته بينكم محرما فلا تظالموا"

ایصالِ ثواب

وفي دعاء الأحياء وصدقاتهم منفعة للميت.

اور مردوں کے واسطے زندوں کی دعا میں اور مردوں کی طرف سے زندوں کے صدقہ خیرات کرنے میں مردوں کو نفع ہوتا ہے۔

ایصالِ ثواب کا ثبوت بہت سی احادیث اور آثار سے ہے، شارع نے مردوں کے لئے زندوں کی دعا اور ان کی طرف سے صدقہ خیرات، تلاوت یا تسبیح و تہلیل، نفلی نماز وغیرہ کے نفع بخش ہونے کی خبر دی ہے، لہٰذا اہل سنت والجماعت اصل ایصالِ ثواب میں متفق ہیں۔ عباداتِ بدنیہ میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام احمد اور جمہور سلف رحمہم اللہ کے نزدیک بدنی عبادات کے ساتھ ساتھ مالی عبادات کا ثواب دوسرے مسلمان کو پہنچانا

جائز ہے۔ البتہ ایصال ثواب کے لئے اجتماع کا اہتمام اور اس میں قیود و رسوم جیسے سوئم، جمعرات، چہلم، برسی نیز اہل میت کی طرف سے دعوت کرنا یہ سب امور بدعت اور ناجائز ہیں، ہاں ایصال ثواب قیود و رسم کی پابندی سے ہٹ کر جب بھی کرے اور جس چیز کی بھی کرے تو وہ ثواب میت کو پہنچ جاتا ہے یعنی صدقہ، خیرات، دعا اور تلاوت قرآن مجید سب کا ثواب میت کو پہنچ سکتا ہے البتہ ایصال ثواب کے لئے اجرت پر قرآن پڑھوانا درست نہیں ہے۔ (ایصال ثواب بصورت قرآن کے لئے دیکھئے (شرح عقیدۃ الطحاویہ لابن ابی العز اور سورۃ نجم کی آیت کے تحت تفسیر مظہری) جمہور کے برعکس امام شافعی اور امام مالک رحمہ اللہ صرف عبادات مالیہ میں وصول ثواب کے قائل ہیں۔ البتہ معتزلہ وغیرہ مطلقاً ایصال ثواب کے منکر ہیں یہ حضرات قرآن کریم کی آیت: ﴿ولیس للانسان الا ما سعی﴾ [سورہ نجم:۳۹] سے یوں استدلال کرتے ہیں کہ قرآن تو نفع آخرت کو صرف اپنی ذاتی سعی میں منحصر بتلا رہا ہے۔ جس سے غیر کی سعی کے نافع ہونے کی نفی نکل رہی ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ آیت میں سعی ایمانی مراد ہے جو آخرت میں غیر کے کام نہیں ہو سکتی کہ ایمان تو کسی کا ہو اور نجات کسی کی ہو جائے باقی احادیث و آثار میں سعی عملی مراد ہے جو ایک کی دوسرے کے کام آسکتی ہے، چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانوی فرماتے ہیں کہ: ایمان کے بارے میں صرف اپنی کمائی ملے گی یعنی کسی کو دوسرے کا ایمان اس کے کام نہ آئے گا۔ کسی کو ایصال ثواب کرنا بھی تو انسان کی سعی ہے جب اس کا ایصال کردہ ثواب مردہ کو مل جائے تو ایصال کنندہ کو اپنی سعی مل گئی دوسرا جواب یہ ہے کہ صرف اپنے عمل کا فائدہ اللہ کا عدل ہے اور دوسرے کے عمل سے فائدہ اللہ کا فضل ہے۔ ایصال ثواب عقلاً بھی جائز ہے، کیونکہ ثواب دراصل بھلائی کرنے والے کا حق ہے، لیکن جب وہ اس ثواب کو اپنے کسی مسلمان بھائی کے لئے ہبہ کرتا ہے، تو اس سے کوئی مانع نہیں، جیسے زندگی میں اگر کسی مسلمان کو اپنا مال ہبہ کرنا چاہے یا اس کی موت کے بعد اپنے حق کو معاف کر کے میت کو بری الذمہ کرنا چاہے تو اس کا بھی کوئی مانع نہیں۔

> والله تعالیٰ یستجیب الدعوات ویقضی الحاجات
>
> اللہ تعالیٰ دعاؤں کو قبول اور حاجات کو پورا کرتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ادعونی استجب لکم﴾ (الغافر: ۶۰) یہ آیت امت محمدیہ کا خاص اعزاز ہے کہ ان کو دعا مانگنے کا حکم دیا گیا اور اس کی قبولیت کا وعدہ کیا گیا اور جو دعا نہ مانگے، اس کے لئے عذاب کی وعید آئی ہے، چنانچہ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: "من لم یسأل اللّٰہ یغضب علیہ" جو دعا نہیں مانگتا، اس سے اللہ ناراض ہوتے ہیں۔　ولِلّٰہِ درُّ القائل

الرب یغضب ان ترکت سؤاله　　　وبنی آدم حین یسئل یغضب

مسلمان جو بھی دعا اللہ سے کرتا ہے اللہ اس کو عطا فرماتا ہے، بشرطیکہ اس میں کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو، اور قبول فرمانے کی تین صورتوں میں سے کوئی صورت ہوتی ہے، ایک یہ کہ جو مانگا وہی مل گیا دوسرے یہ کہ اس کی مطلوب چیز کے بدلے اس کو آخرت کا کوئی اجر و ثواب دے دیا گیا تیسرے یہ کہ مانگی ہوئی چیز تو نہ ملی مگر کوئی آفت و مصیبت اس پر آنے والی تھی وہ ٹل گئی۔ (مسند احمد)۔ کافر کی دعا، اگر دنیا سے متعلق ہو تو قبول ہو سکتی ہے اور اگر آخرت سے متعلق ہو تو قبول نہ ہوگی۔

> ویملک کل شیء ولا یملکه شیء ولا غنیٰ عن الله طرفة عین ومن استغنی عن الله طرفة عین فقد کفر وصار من أهل الحین.
>
> اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے اس کا کوئی مالک نہیں اللہ تعالیٰ سے پلک جھپکنے کی مقدار اور ایک لحظہ بھی کوئی بے نیاز نہیں ہو سکتا اور جو شخص لحظہ بھر بھی اللہ تعالیٰ سے بے نیاز ہو گیا تو اس نے کفر کا ارتکاب کیا اور وہ ہلاکت زدہ لوگوں میں شامل ہو گیا۔

الحین: بالفتح: ہلاکت

وإن الله تعالى يغضب ويرضى لا كأحد من الورى.

اللہ تعالیٰ ناراض بھی ہوتا ہے اور خوش بھی لیکن اس کی ناراضی اور خوشی مخلوق جیسی نہیں ہوتی۔

"لا كأحد من الورى" میں نفی تشبیہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے غضب، رضا، عداوت، محبت اور بغض جیسی صفات قرآن وحدیث سے ثابت ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس کرنا سخت نادانی ہے۔ جمہور سلف اس قسم کی صفات کی تشریح ہی سے توقف کرتے ہیں، کیونکہ ارشاد ہے: ﴿ليس كمثله شيء﴾ مخلوقات سے اللہ کو کوئی مشابہت نہیں۔ مثلاً جب کسی آدمی کو غصہ آتا ہے تو اس کے نتیجے میں غلیان دم القلب (قلب کے خون کے جوش مارنے) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، جبکہ اللہ کی صفت میں غضب کا یہ نتیجہ ہرگز نہیں ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات قلب اور دم سے منزہ ہے، بلکہ فرشتوں کے لئے بھی صفت غضب ثابت ہے مگر وہ بھی انسان کے غضب کی کیفیت کے مماثل نہیں، کیونکہ غلیان قلب کے خون کے جوش مارنے کا تصور ان میں بھی نہیں ہے۔

ونحب أصحاب رسول الله ﷺ ولا نفرط في حب أحد منهم ولا نتبرأ من أحد منهم ونبغض من يبغضهم وبغير الخير يذكرهم ولا نذكرهم إلا بخير. وحبهم دين وإيمان وإحسان وبغضهم كفر ونفاق وطغيان.

ہم اصحاب رسول اللہ ﷺ سے محبت کرتے ہیں اور ہم (شیعوں کی طرح) ان میں سے کسی کی محبت میں اس کے حق سے زیادہ نہیں بڑھتے اور نہ ہی ان میں سے کسی سے براءت کا اظہار کرتے ہیں ہم اس سے بغض رکھتے ہیں، جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض رکھتا ہے اور (ہم اس سے بھی بغض رکھتے ہیں) جو ان کا اچھے انداز میں نام نہیں لیتا، ہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ذکر خیر ہی کرتے ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت دین ایمان اور احسان کی علامت ہے اور ان سے بغض کفر، نفاق اور سرکشی ہے۔

اس عبارت میں امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ روافض وغیرہ کی تردید کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور صحابہ کی عظمت بیان کر رہے ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ نے "الإصابة" میں صحابی کی تعریف یوں کی ہے "وھو من لقي النبي صلى الله عليه وسلم مؤمنا به ومات على الإسلام" یعنی صحابہ سے مراد وہ قدسی صفات ہستیاں ہیں جنہوں نے بحالت ایمان، نبی ﷺ کی صحبت پائی اور تادم مرگ ایمان پر قائم رہے یہ ایسی بزرگ ہستیاں ہیں کہ انبیاء کے بعد کوئی بھی شخص خواہ کتنی ہی عبادت و ریاضت کر ڈالے ان کے مقام و مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ تمام صحابہ کرام عادل، مؤمن اور متقی ہیں۔ قال ملا علي القاري: "الصحابة كلهم عدول مطلقا لظواهر الكتاب والسنة وإجماع من يعتد به."
(مرقاة: ٥/١٧٥) بہر حال صحابہ کی عظمت و تقدس ہمارا دین و ایمان ہے۔ قرآن و سنت اور دین کے تمام سے جو کچھ بھی ہم تک پہنچا ہے وہ صحابہ ہی کے ذریعہ پہنچا ہے اگر کوئی اٹھ کر ان ستونوں کو گراتا ہے تو جو کتاب و سنت ان کے ذریعہ ہم تک پہنچی اور ان پر دین کی عمارت کھڑی ہے یہ ساری منہدم ہو جائے گی۔ صحابہ کرام کی تعریف قرآن (کی سورۃ توبہ: ١٠٠، سورۃ فتح: ١٨-٢٩، سورۃ انفال ٧٢، سورۃ الحدید: ١٠ اور الحشر: ٨-١٠) میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمائی ہے، جناب نبی کریم ﷺ نے کئی احادیث میں صحابہ کی شان کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جو لوگ صحابہ کرام پر تنقید کی گنجائش نکالتے ہیں ان کے اندر سبائیت اور یہودیت کے جراثیم بول رہے ہیں اور بقول امام شعبی وہ یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر ہیں؟ کیونکہ جب یہود و نصاریٰ سے پوچھا گیا کہ تمہاری امت میں زیادہ بہتر کون لوگ ہیں؟ تو یہود نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب اور نصاریٰ نے کہا کہ حواریین یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے صحابہ، اور ایک یہ لوگ ہیں کہ اپنے رسول کے اصحاب کو بدترین امت ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

"ولا نتبرأ من أحد منهم: یعنی اہل سنت اعتدال کے راستے پر چلتے

ہوئے کسی بھی صحابی سے براءت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ تمام صحابہ بشمول اہل بیت سے محبت کا اظہار کرتے ہیں، جبکہ روافض نے افراط سے کام لیا، چنانچہ ان کے ہاں اہل بیت کی محبت اس وقت تک کامل نہیں کہ جب تک ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے برأت کا اظہار نہ کیا جائے، دوسری طرف خوارج نے تفریط سے کام لیکر صحابہ کو ان کے درجے سے نیچے گرایا، چنانچہ انہوں نے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اور اہل بیت سے براءت ظاہر کی، مودودی صاحب نے بھی صحابہ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے (تفہیمات طبع چہارم: ۲۹۴) اور" خلافت وملوکیت" نامی کتاب میں تو بغض صحابہ وجہ کے زہر کو علانیہ اگل دیا ہے۔

و بغضهم کفر۔ یعنی صحابہ سے بغض کفر ہے، یہاں کفر سے کفر اصطلاحی مراد نہیں، بلکہ جیسے ﴿ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الکافرون﴾ میں کافر سے مراد عملی کافر ہے کہ "ما انزل اللہ" کو عقیدۃ ثابت مان کر، پھر فیصلہ عملاً اس کے خلاف کرے، تو اس کی عملی حالت کافروں جیسی ہے، ایسے ہی یہاں مطلب یہ ہے کہ صحابہ سے بغض کرنا کافروں جیسا کام ہے۔

خلافت

ونثبت الخلافة بعد رسول الله ﷺ اولاً لابي بكر الصديق ﷺ تفضيلاً له وتقديماً على جميع الامة، ثم لعمر بن الخطاب، ثم لعثمان بن عفان، ثم لعلي بن ابي طالب رضوان الله عليهم أجمعين وهم الخلفاء الراشدون والائمة المهتدون، الذين قضوا بالحق وكانوا به يعدلون.

حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کو ہم رسول اللہ ﷺ کا پہلا خلیفہ مانتے ہیں، اس لئے کہ وہ امت میں افضل ترین ہستی تھے، ان کے بعد درجہ بدرجہ حضرت عمر بن خطاب ﷺ کو دوسرا، حضرت عثمان بن عفان ﷺ کو تیسرا اور حضرت علی ابن ابی طالب ﷺ کو چوتھا خلیفہ تسلیم کرتے ہیں اور یہ خلفاء راشدین ہیں اور ہدایت یافتہ امت کے امام ہیں۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلاف کا اس پر اتفاق ہے کہ حضور ﷺ کے بعد عیسیٰ علیہ السلام (جو چوتھے آسمان پر زندہ موجود ہیں) کے علاوہ باقی تمام انسانوں سے افضل ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، آپ رضی اللہ عنہ کا نام عبداللہ، لقب صدیق اور عتیق اور کنیت ابوبکر ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آنحضرت ﷺ نے اپنے مرض وفات میں اپنی جگہ پر امام بنایا تھا، آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔

"مروا ابابکر فلیصل بالناس" (بخاری: ۶۶۳) اب یہ کھلا ہوا اشارہ ان کی خلافت کا تھا (اس آخری وقت کے علاوہ بھی جب کبھی آنحضرت ﷺ خود امامت نہ کر سکتے تو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ ہی کو امامت کا حکم دیتے)

تفصیل کے لئے خلفاء راشدین ص ۴۴ مولانا عبدالشکور لکھنوی)

نیز اسی بخاری میں آپ ﷺ نے ان کے لئے خلافت نامہ لکھوانے کا قصد وغیرہ ظاہر فرمایا مگر پھر کسی مصلحت سے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور فرمایا سوائے ابوبکر کے اور کسی کے لئے اللہ کی مشیت نہ ہوگی اور مسلمان بھی راضی نہ ہوں گے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث ۲۳۸۷) عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ اول ہوں، کیونکہ جس ترتیب سے خلفاء راشدین دنیا سے کوچ کر گئے ہیں اسی ترتیب سے ان کو خلافت ملی ہے اور یہ طے ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ انتقال کر گئے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خلیفہ اول اور خلیفہ بلا فصل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پیغمبر ﷺ کی وفات کے بعد حضور ﷺ کے دفن سے قبل انصار کے ایک قبیلہ بنو ساعدہ کے دالان اور برآمدہ میں مہاجرین وانصار سب کا اتفاق حضرت صدیق رضی اللہ عنہ پر ہو گیا اور موجود لوگوں نے ان کے دست حق پرست پر بیعت کر لی، بیعت کی ابتداء ایک انصاری سے ہوئی۔ (تاریخ الخلفاء)

اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مستحق خلافت نہ ہوتے تو صحابہ ان کی خلافت پر اجماع نہ کرتے، کیونکہ از روئے حدیث یہ امت کبھی باطل پر اجماع نہ کرے گی۔

فرمایا۔ شہادت کے مرتبہ پر فائز ہو کر پہلوئے نبوت میں دفن ہوئے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے زخمی حالت میں مسئلہ خلافت چھ حضرات کی کمیٹی عثمان، علی، عبدالرحمن بن عوف، طلحہ، زبیر اور سعد بن ابی وقاص رضوان اللہ علیہم کے باہمی مشورہ پر چھوڑ گئے پھر ان میں سے پانچ نے معاملہ عبدالرحمن بن عوف کے سپرد کردیا اور ان کے فیصلے پر رضامندی ظاہر کردی تو انہوں نے ابو عبداللہ حضرت عثمان بن عفان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا اور صحابہ کی ایک مجلس میں ان سے بیعت کی پھر دوسرے لوگوں نے ان سے بیعت کی اس طرح سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماع ہو گیا۔ خلیفہ ثالث سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے ۲۴ھ کو مسند خلافت پر ۱۲ سال ۱۱ یوم خلیفہ رہے۔ ۸۲ برس کی عمر میں ۱۸ ذوالحجہ ۳۵ھ کو ایک سازش کے تحت انتہائی مظلومیت کی حالت میں سودان التجیبی کے ہاتھوں شہید ہو کر جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تو شہید ہو گئے مگر خلیفہ کا معاملہ بغیر طے کئے لوگوں پر چھوڑ گئے تو بڑے بڑے مہاجرین وانصار نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اتفاق کیا اور ان سے منصب خلافت قبول کرنے کی درخواست کی اور ان سے بیعت کی، کیونکہ وہ اپنے ہم عصروں میں افضل اور خلافت کے زیادہ حقدار تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا نام علی، لقب اسد اللہ اور مرتضیٰ اور کنیت ابوالحسن اور ابوتراب ہے۔ خلیفہ رابع سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ۴ سال ۹ ماہ خلافت کرنے کے بعد ۲۱ رمضان المبارک ۴۰ھ میں عبدالرحمان ابن ملجم کے ہاتھوں فجر کے وقت جامع مسجد کوفہ میں داخل ہوتے ہی شہید ہوئے۔

عشرہ مبشرہ

وانّ العشرة الّذين سمّاهم رسول اللّٰه ﷺ وبشّرهم بالجنّة نشهد لهم بالجنّة على ماشهد لهم رسول اللّٰه ﷺ وقوله الحق، وهم: أبوبكر، وعمر، وعثمان، وعلي وطلحة، والزّبير، وسعد، وسعيد وعبدالرحمن بن عوف، وأبو عبيدة بن الجرّاح، وهو امين هذه الامّة ﷺ۔

وہ دس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جن کا رسول اللہ ﷺ نے نام لیا اور انہیں جنت کی خوشخبری دی ہم ان کے جنتی ہونے کی گواہی اس بناء پر دیتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اس کی گواہی دی آپ کا فرمان برحق ہے اور وہ دس صحابہ کرام یہ ہیں، ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد، سعید، عبدالرحمن بن عوف، رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ جو اس امت کے امین ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جن دس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جنتی ہونے کی بشارت مشہور ہے، ان میں خلفاء راشدین کے علاوہ چھ مزید صحابہ کرام طلحہ، زبیر، سعد، سعید، عبدالرحمان بن عوف اور ابوعبیدہ بن الجراح رضوان اللہ علیہم بھی شامل ہیں، یہ دس تو "عشرہ مبشرہ" کے نام سے مشہور ہیں، مگر ان کے علاوہ بھی صحابہ کی بعض جماعتوں مثلاً اصحاب بدر اور اصحاب بیعت رضوان کے بارے میں اور بعض افراد مثلاً حضرت فاطمہ، حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت بلال، حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سلمان فارسی رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ کے بارے میں بھی جنت کی بشارت احادیث صحیحہ میں وارد ہے، لیکن چونکہ مذکورہ دس حضرات کے جنتی ہونے کی بشارت ایک ہی حدیث۔(ترمذی اور ابوداؤد میں) میں وارد ہے اس بناء پر ان کے جنتی ہونے کی بشارت مشہور ہوگئی اور وہ عشرہ مبشرہ کہلائے۔

ومن أحسن القول في أصحاب النبي ﷺ وأزواجه الطاهرات من كل دنس و ذرياته المقدسين من كل رجس. فقد برئ من النفاق.

جس نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم، ازواج مطہرات جو ہر عیب سے پاک ہیں اور آپ ﷺ کی اولاد، جو ہر قسم کی خباثت سے پاک ہیں، سے متعلق اچھا تذکرہ کیا جو برائی سے خالی ہو، وہ نفاق سے بری ہوا۔

روافض صحابہ اور ازواج مطہرات کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں، جبکہ اہل سنت کی شان یہ ہے کہ وہ صحابہ کرام، ازواج مطہرات کے علاوہ حضرت فاطمہ، علی، حسن اور حسین رضوان اللہ علیہم سب کی عقیدت ومحبت کے قائل ہیں۔ اہل خانہ بھر آفتاب سنت، امام طحاوی نے یہ جو فرمایا: "فقد برئ من النفاق" اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ روافض وشیعیت کا بانی ایک منافق اور زندیق شخص عبداللہ بن سبا، تھا جو اپنے مکروفریب سے اسلام کا چہرہ مسخ کرنا چاہتا تھا، اس لئے بغض صحابہ اور بغض ازواج مطہرات نفاق کی علامت ہے۔ جو سب کا تذکرہ بھلائی کے ساتھ کرے گا نفاق سے بری ہوگا۔

وعلماء السلف من الصالحين والتابعين ومن بعدهم من أهل الخير والأثر، وأهل الفقه والنظر لا يذكرون إلا بالجميل ومن ذكرهم بسوء فهو على غير السبيل.

علماء سلف صالحین اور تابعین اور جو لوگ ان کے بعد ہوئے، جن کا تعلق اہل خیر وحدیث سے یا فقہ ونظر سے ہو، ہم ان کا ذکر جمیل ہی کرتے ہیں جو ان کا برائی سے ذکر کرے وہ سیدھی راہ پر نہیں۔

علامات قیامت میں سے ایک بات یہ ہے کہ "ولعن آخر هذه الأمة أولها"

(ترمذی: ۲۲۱۳)

اس امت کے پچھلے لوگ اگلے لوگوں پر طعن کریں گے۔ اس دور پرفتن میں جہاں حضور ﷺ کی ذکر کردہ دوسری علامات کا ظہور ہو رہا ہے، وہیں اس علامت کا بھی پوری طرح ظہور ہو رہا ہے۔ امام طحاویؒ کی غرض یہ ہے کہ تمام ائمہ سلف کے ساتھ نیک گمان رکھا جائے، دل سے ان کا احترام کیا جائے اور سمجھا جائے کہ ان میں سے ہر ایک نے کتاب وسنت اور صحابہ کرام کے طرز عمل کا مطالعہ اور اس میں غور وفکر کے بعد جو کچھ اپنے نزدیک زیادہ راجح سمجھا ہے، نیک نیتی سے اس کو اختیار کرلیا ہے ان میں سے کوئی بھی باطل پر نہیں۔

ولانفضل أحدا من الأولياء على أحد من الأنبياء عليهم السلام ونقول: نبيٌّ واحد أفضل من جميع الأولياء.

ہم کسی بھی ولی کو کسی نبی پر فضیلت نہیں دیتے، ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ایک نبی تمام اولیاء سے افضل ہے۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ کوئی بھی آدمی خواہ کتنی ہی عبادت وریاضت کر ڈالے، انبیاء کے مرتبہ اور مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔

بعض کرامیہ نے کہا ہے کہ "الولاية أفضل من النبوة" اور ان میں سے بعض کا مقولہ ہے کہ "اولیاء کی ابتداء انبیاء کی انتہاء ہے" مگر یہ باتیں حقیقت سے بہت دور ہیں، حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے یعنی انبیاء کی جہاں سے ابتداء ہوتی ہے وہ اولیاء کی انتہاء ہے، بقول شیخ مجدد الف ثانیؒ کے کہ: "کمالات ولایت، کمالات نبوت کے مقابلہ میں وہی نسبت رکھتے ہیں جو قطرہ کو سمندر کے ساتھ ہے"، حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ (۶۶۱-۷۸۲ھ) نے تو یہاں تک لکھا کہ انبیاء کی ایک سانس اولیاء کی پوری زندگی سے افضل ہے۔ ولی کی ولایت اتباع رسول پر موقوف ہے۔ اتباع رسول کی وجہ سے ولی کو ولایت حاصل ہے (ولی کی کرامت نبی کا معجزہ ہے، بیان القرآن ۹۸/۷) علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: "وكرامات أولياء الله إنما حصلت ببركة إتباع رسوله صلى

الله عليه وسلم فهي في الحقيقة تدخل في معجزات الرسول صلى الله عليه وسلم" (فتاوی ابن تیمیہ: ۲۷۲/۱۱) اس کے علاوہ بات یہ ہے کہ نبوت ایک وهبی مقام ہے، جبکہ ولایت کسبی ہے، بہرحال مقام نبوت ولایت سے افضل ہے، واضح رہے کہ ہر نبی ولی ہوتا ہے مگر ہر ولی نبی نہیں ہوتا گویا نبی میں نبوت بھی ہے، ولایت بھی ہے، مگر ولی میں صرف ولایت ہے وہ بھی نبی کی ولایت سے کم۔

نوٹ: انبیاء معصوم اور اولیاء محفوظ ہیں۔ معصوم وہ ہے کہ اس سے باوجود استعداد گناہ، گناہ سرزد ہونا محال ہو اور محفوظ وہ ہے کہ گناہ اس سے ممکن ہو، اگر چہ واقع نہ ہو، پہلی صورت مستلزم محال ہے دوسری ممکن، غیر واقع ہے۔ (از ملفوظات شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ)

ونؤمن بما جاء من كراماتهم وصح عن الثقات من رواياتهم. ہم اولیاء کرام کی کرامات کو مانتے ہیں اور ان کی روایت کو بھی مانتے ہیں، جو ثقات اور معتبر لوگوں سے صحیح طریقے سے ثابت ہوئی ہیں۔

معجزہ اور کرامت کا فرق

جو خرق عادت مکذبین نبوت کے الزام اور تعجیز کے لئے نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو، وہ معجزہ ہے اور اگر اس خرق عادت سے مقصود محض تشریف اور تکریم ہو تو وہ کرامت ہے خواہ نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو یا ولی کے، لہٰذا معجزہ نبی کے ساتھ مخصوص ہے اور کرامت عام ہے۔ (نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض "باب الرابع" (بحوالہ علم الکلام ۲۸۱) ایک فرق معجزہ اور کرامت میں یہ ہے کہ معجزہ کا اظہار ضروری ہے بخلاف کرامت کے کہ اس کا اخفاء ضروری ہے۔ بالاخفاء ضرورة (الیواقیت والجواهر) خواجہ نظام الدین اولیاء کا ملفوظ ہے: "فرض الله تعالى على أولياء ه كتمان الكرامة كما فرض على أنبيائه إظهار المعجزة." (مجلس ۱۱: ۵۸۸/۳) واضح رہے کہ کرامت اور معجزہ میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ وہ براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، معجزہ اور

کرامت دونوں ہی نبی اور ولی کے اختیار میں نہیں ہوتے، بلکہ جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو معجزہ نبی کے ہاتھوں اور کرامت ولی کے ہاتھوں ظاہر فرما دیتے ہیں۔

اقسام خارق عادت

جو چیز بھی خارق عادت ہو اس کا صدور یا نبی سے ہوگا یا غیر نبی سے۔ اگر نبی سے ہے تو دعویٰ نبوت سے پہلے ہوگا یا بعد میں ہوگا۔ اگر دعویٰ نبوت سے پہلے ہے تو اس کو "ارھاص" کہتے ہیں۔ اگر اس خارق عادت چیز کا صدور دعویٰ نبوت کے بعد ہو تو وہ "معجزہ" ہے۔ اور اگر خارق عادت کا صدور غیر نبی سے ہو تو ولی سے ہوگا یا غیر ولی سے ہوگا۔ اگر ولی سے ہو تو اس کو "کرامت" کہتے ہیں۔ اگر غیر ولی سے ہوگا تو یا مومن ہوگا جس کا صالح یا فاسق ہونا معلوم نہ ہو یا کافر یا فاسق سے ہوگا۔ اگر عام مومن سے ہو تو اس کو "معونت" کہتے ہیں، اگر کافر یا فاسق سے ہو تو اس کو "استدراج" کہتے ہیں، اور اگر ایسی خرق عادت مدعی نبوت کے مقصد اور مطلب کے بالکل خلاف ظاہر ہو (جیسے مسیلمہ کذاب نے ایک کانے شخص کی آنکھ پر لعاب لگایا تاکہ اس کی آنکھ درست ہو جائے، لیکن الٹا اس کی دوسری آنکھ بھی نابینا ہو گئی) تو اس کو "اھانت" اور "خذلان" کہتے ہیں یعنی اللہ کی طرف سے یہ رسوائی ہے۔

معتزلہ نے کرامت کا انکار اس لئے کیا ہے کہ اگر اولیاء سے کرامت ظاہر ہو جائے تو کرامت کے معجزہ ہونے کا شبہ ہوگا، کیونکہ دونوں امر خارق العادت ہیں، ایسی صورت میں نبی اور ولی میں تمیز نہیں رہے گی۔ لیکن معتزلہ کی یہ بات غلط ہے، کیونکہ کرامت جس شخص کے ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہے وہ مدعی نبوت نہیں ہوتا، برخلاف معجزہ کے کہ وہ مدعی نبوت کے ہاتھ پر ظاہر ہونے والا خارق عادت امر ہے، اسی لئے کرامت کے معجزہ ہونے کا شبہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت مریم علیہا السلام کی کرامت کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خط سے دریائے نیل کا جاری ہو جانا اور "نہاوند" میں اپنے لشکر کو پکار کر یا ساریۃ الجبل کہنا اور ان لوگوں کا ان کی آواز کو سن لینا باوجود دوری کے ساتھ

منقول ہیں۔

فائدہ: حضرت اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں: ''اگر اتباع سنت نہیں تو کچھ بھی نہیں چاہے ہوا پر اڑتا ہو یا پانی پر چلتا ہو۔ (ملفوظات)

علامات قیامت

> ونؤمن باشراط الساعۃ منھا: خروج الدجال ونزول عیسی علیہ السلام من السماء ونؤمن بطلوع الشمس من مغربھا وخروج دابۃ الارض من موضعھا.
>
> ہم علامات قیامت پر ایمان ویقین رکھتے ہیں مثلاً دجال کا خروج عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کا آسمان سے نازل ہونا سورج کا مغرب سے طلوع ہونا "دابۃ الارض" کا اپنی جگہ سے نکلنا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے جن علامات قیامت کی خبر دی ہے ان علامات قیامت پر ایمان لانا واجب ہے۔ ان علامات قیامت کی تفصیل اور توضیح سیر، تاریخ اور حدیث وتفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔ وقد افرد الناس احادیث اشراط الساعۃ فی مصنفات مشہورۃ.

قیامت کی علامات صغریٰ بہت ہیں جن کو ذکر مختلف احادیث میں ہے اور علامات کبریٰ بارہ ہیں یعنی ظہور مہدی رضی اللہ عنہ، خروج دجال، نزول عیسیٰ علیہ السلام، یاجوج ماجوج، دھویں کا ظاہر ہونا، زمین کا دھنس جانا، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، صفا پہاڑ سے جانور کا نکلنا، ٹھنڈی ہوا کا چلنا اور تمام مسلمانوں کا وفات پا جانا، حبشیوں کی حکومت اور بیت اللہ کا شہید ہونا، آگ کا لوگوں کو ملک شام کی طرف ہانکنا، صور پھونکا جانا اور قیامت کا قائم ہونا۔

یہاں امام طحاوی نے علامات کبریٰ میں سے خاص کر چار کا تذکرہ کیا ہے۔

اب یہاں چند امور کی وضاحت ضروری ہے (۱) دجال یہودی قوم کا ہے جس کا لقب مسیح ہے۔ فتنوں کے زمانہ میں جو کچھ دجال سے احیاء واماتت اور خوارق کا ظہور ہوگا یہ ظہور

مذہب القرین اور شجرہ میں، یونس بخاری میں ہے "وان المسیح الدجال اعور عین الیمنی" مسیح دجال کی دائیں آنکھ کانی ہوگی جبکہ اللہ تعالیٰ کانا نہیں۔ (بخاری، ص ۱۰۵۰)

ایسے ہی دجال کے بارے میں صحیح مسلم کی حدیث ہے "مکتوب بین عینیہ کافر، یقرأہ کل مؤمن کاتب وغیر کاتب" دجال کی پیشانی پر کافر لکھا ہوا ہوگا، جس کو ہر مؤمن پڑھ لے گا خواہ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ ہو۔ (۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام دمشق کی جامع مسجد کے مشرقی جانب کے سفید رنگ کے مینار پر نازل ہوں گے نزول کے بعد ۴۰ یا ۴۵ سال قیام کریں گے۔ باب "لد" (جو کہ آج کل اسرائیلیوں کا ائیر پورٹ ہے) پر دجال کو قتل کریں گے۔ دیگر تفصیل احادیث میں ہیں۔ اب قادیانی مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے ایک اعتراض پیش کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اترنے کے بعد منصب نبوت پر فائز ہوں گے یا نہیں؟ اگر وہ بحیثیت نبی آئیں گے تو ختم نبوت پر زد پڑتی ہے، اگر نبی نہیں ہوں گے تو ایک نبی کا نبوت سے معزول ہونا لازم آتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے خاتم الانبیاء ہونے کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کسی کو عہدہ منصب نبوت پر فائز نہیں کیا جائے گا، ختم نبوت کا معنی عطاء نبوت کی بندش ہے جس پر مہر لگ گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو آپ کی آمد سے صدیوں پہلے منصب نبوت پر فائز ہو چکے ہیں، اب کہ مرتبہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو آپ کی نبوت موقوف ہوگی، معطل نہ ہوگی، یعنی آپ نبوت سے معزول نہیں ہوں گے لیکن امت محمدیہ میں ان کی نبوت کا قانون نافذ نہیں ہوگا بلکہ صرف حضور ﷺ ہی کا نافذ ہوگا اور قانون محمدی پر عمل کرنے کی وجہ سے آپ حضور ﷺ کے امتی کی حیثیت سے ہوں گے مگر منصب رسالت ہو کر ایک عام شخص امتی کی طرح ہو کر نہیں ہوں گے۔ جیسے ایک شخص ملک پاکستان کا صدر ہے وہ سعودی عرب کے سرکاری دورے پر جاتا ہے اب ظاہر ہے کہ وہ ذاتی صدارت کے منصب سے معزول نہیں ہوا لیکن سعودی عرب پر اس کا حکم بھی نہیں چلے گا، وہاں پر حکم سعودی عرب کے بادشاہ کا

ونرى الجماعة حقًا وصوابًا والفُرقة زيغًا وعذابًا.

ہم جماعت کو حق اور درست سمجھتے ہیں اور فرقہ بندی کو کج روی اور عذاب گردانتے ہیں۔

"جماعت" کے بارے میں صحابہ ؓ نے پوچھا: "من هي يا رسول الله؟ قال: "ما أنا عليه وأصحابي" معلوم ہوا کہ اہل سنت والجماعت فرقۂ ناجیہ ہے، اہل سنت والجماعت سے ہٹ کر باقی فرقے جو بدعت و ضلال جادۂ حق سے منحرف ہو کر فرقہ بندی اور افتراق کے شکار ہیں۔

واضح رہے کہ اجتہادی اختلاف، بشرطیکہ اصول اجتہاد کے مطابق ہو، وہ ہرگز تفرقہ نہیں، صحابہ و تابعین اور ائمہ فقہاء کا اختلاف اسی قسم کا اختلاف تھا۔ تفریق وہ مذموم ہے جو اصول دین میں ہو یا فروع میں نفسانیت کے غلبہ کی وجہ سے ہو، یا اس معنی کہ فروعی مسائل کو اصل دین قرار دیا جائے، اور ان میں اختلاف کو جنگ و جدل اور سب و شتم کا ذریعہ بنالیا جائے۔ قرآن و حدیث میں جہاں بھی تفرقہ کی مذمت ہے وہ وہی تفرقہ و اختلاف ہے، جو بیّنہ (پوری وضاحت) کے بعد کیا جائے۔

یاد رکھئے مفسرین، محدثین، فقہاء (مذاہب اربعہ) اور حق پرست صوفیاء کرام، سب اہل سنت والجماعت ہیں، علماء دیوبند اہل سنت والجماعت سے ہٹ کر کوئی جدید گروہ اور فرقہ قطعاً نہیں، بلکہ اسی سواد اعظم اور فرقہ ناجیہ کا ایک حصہ ہے، دار العلوم دیوبند مرکز کی طرف انتساب کی وجہ سے ان کا نام "علماء دیوبند" پڑ گیا۔ جو در حقیقت اس دور میں اہل سنت والجماعت اور سواد اعظم کی ایک تعبیر ہے۔

ودين الله في الأرض والسماء واحد وهو دين الإسلام، قال الله تعالى ﴿إن الدين عند الله الإسلام﴾ [آل عمران: ١٩]

وقال الله تعالى: ﴿ورضيت لكم الإسلام دينا﴾ [المائدة: ٣]

وهو بين الغلوّ والتقصير، وبين التشبيه والتعطيل وبين الجبر والقدر، وبين الأمن والإياس.

اللہ کا دین زمین و آسمان میں صرف ایک ہی ہے اور وہ دین اسلام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے" اور فرمایا "اور میں نے اسلام کو تمہارے لئے بطور دین پسند کرلیا" یہ دین افراط و تفریط، تشبیہ و تعطیل، جبر و قدر اور بے خوفی و نا امیدی کے درمیان ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں لفظ دین ان اصول و احکام کے لئے بولا جاتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء ﷺ تک سب انبیاء میں مشترک ہیں اور لفظ "شریعت" یا "منہاج" یا بعد کی اصطلاحات میں لفظ "مذہب" فروعی احکام کے لئے بولے جاتے ہیں، جو مختلف زمانوں اور مختلف امتوں میں مختلف ہوتے چلے آئے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ دین سب انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی تھا اور لفظ "اسلام" کے لغوی معنی اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں اس معنی کے اعتبار سے ہر نبی اور رسول کے زمانہ میں جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کے لائے ہوئے احکام میں ان کی فرمانبرداری کی وہ سب مسلمان اور مسلم کہلانے کے مستحق تھے اور ان کا دین، دین اسلام تھا اور بعض اوقات یہ لفظ خصوصیت سے اس دین و شریعت کے لئے بولا جاتا ہے جو سب سے آخر میں خاتم الانبیاء ﷺ لیکر آئے اور جس نے پچھلی تمام شرائع کو منسوخ کردیا اور جو قیامت تک باقی رہے گا اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ صرف دین محمدی ﷺ اور امت محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہوجاتا ہے۔ (معارف القرآن: ۲/۳۶)

في الأرض والسماء: یعنی ہمارا دین زمان اور مکان کے اعتبار سے عام ہے، اسلام کا رواج زمین، سمندر، آسمان اور فضاء ہر جگہ میں ہوگا۔

قوله: "وهو بين الغلوّ والتقصير" "غلو" کے لفظی معنی حد سے نکل جانے کے ہیں اور "تقصير" کے معنی میں حد سے کمی کرنا، شریعت اسلامیہ کا ہر حکم معتدل اور متوسط ہے افراط و تفریط سے پاک ہے، نہ تو شریعت موسویہ کی طرح اس میں شدت اور سختی ہے۔ (مثلاً طہارت حاصل کرنے کے لئے موضع نجاست کپڑے کا کاٹنا، زکوۃ میں

چوتھائی مال ادا کرنا وغیرہ) اور نہ شریعت عیسویہ کی طرح حد سے زیادہ نرمی اور آسانی ہے۔ (مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں شراب حلال تھی، سود اور مردار کا گوشت حلال تھا، قتل عمد میں قصاص واجب نہ تھا وغیرہ) شریعت اسلامیہ شدت اور خفت کے بین بین ہے۔ "وخير الأمور أوسطها۔"

قوله "وبين التشبيه والتعطيل، وبين الجبر والقدر، وبين الأمن والإياس"۔

فرقہ مشبہ کے لوگوں کے عقائد میں افراط ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ قرار دیا اور اس کے لئے جسم اور جہت کو ثابت کیا ہے اور فرقہ معطلہ کے عقائد میں تفریط ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتے ہیں، ان کے برخلاف اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم وجہت سے منزہ ہیں اور جن صفات کا ذکر قرآن وحدیث میں ہے وہ اللہ کے لئے ثابت ہیں۔ ﴿ليس كمثله شيء، وهو السميع البصير﴾ میں دونوں کی تردید ہے "ليس كمثله شيء" میں مشبہ کی تردید ہے اور "هو السميع البصير۔" میں معطلہ کی تردید ہے۔

اسی طرح فرقہ قدریہ کے عقائد میں افراط ہے، انہوں نے بندوں کے لئے قدرت کاسبہ اور قدرت خالقہ دونوں کو ثابت کیا ہے ان کے ہاں بندہ اپنے افعال کا کاسب بھی ہے اور خالق بھی، اور فرقہ جبریہ کے عقائد میں تفریط ہے ان کے ہاں بندہ جماد محض ہے نہ اس کو کسب کی قدرت حاصل ہے اور نہ خلق کی قدرت حاصل ہے ان دونوں کے برخلاف اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ بندہ کے لئے قدرت خالقہ تو ثابت نہیں کیونکہ وہ اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ البتہ قدرت کاسبہ ثابت ہے۔ حضرت علیؓ نے اس نازک مسئلہ کو بہت خوبی اور آسانی سے ذہن نشین فرمایا تھا، چنانچہ ایک شخص نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مسئلہ جبر واختیار دریافت کیا آپؓ نے اس شخص سے فرمایا ایک پیر اٹھا کر کھڑا ہو جا اس نے ایک پیر اٹھالیا پھر فرمایا کہ دوسرا پیر اٹھالے، اس نے

عرض کیا حضرت: دو ایک تو نہیں الجھ گئے۔ فرمایا: یہی حالت بندہ کی ہے نہ پورا اختیاری ہے نہ پورا مجبور۔ (ملفوظات اشرفیہ ص ۱۱)

اسی طرح یہ دین بے خوفی اور نا امیدی کے درمیان ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ "الإيمان بين الخوف والرجاء" ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے، کہ تنہا خوف لوگوں کو اللہ کے رحم وکرم سے نا امید اور محض رحم وکرم پر بھروسہ ان کو خود سر اور سرکش بنا دیتا ہے۔

فهذا ديننا واعتقادنا ظاهرًا وباطنًا. ونحن براء إلى الله من كل من خالف الذي ذكرناه وبيناه ونسأل الله تعالى أن يثبتنا عليه ويختم لنا به، ويعصمنا من الأهواء المختلفة والآراء المتفرقة والمذاهب الرديّة كالمشبهة والمعتزلة والجهمية والجبرية والقدرية وغيرهم ممن خالف السنة والجماعة واتبع البدعة والضلالة ونحن منهم براء وهم عندنا ضلال وأردياء وبالله العصمة والتوفيق.

یہ (کتاب کے اول سے لیکر یہاں تک) ہمارا دین ہے اور ظاہر وباطن میں یہی ہمارا عقیدہ ہے اور ہم اللہ کے سامنے براءت کرتے ہیں اس شخص سے جو اس طریقہ کا مخالف ہو جو ہم نے کتاب میں ذکر کیا اور ہم اللہ سے سوال کرتے ہیں کہ ہم کو ایمان پر ثابت قدم رکھیں اور ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائے اور ہم کو مختلف خواہشات سے بچائے اور مختلف مشوروں سے بچائے اور خراب مذاہب سے بچائے۔ جیسے مشبہہ اور معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ اور ان کے علاوہ ان لوگوں میں سے جنہوں نے سنت اور جماعت کی مخالفت کی اور گمراہی کے دوست بن گئے اور ہم ان سے بیزار ہیں اور وہی ہمارے نزدیک گمراہ اور گھٹیا ہیں۔ اللہ ہی کے ساتھ عصمت (حفاظت) اور توفیق ہے۔

مشبہہ: مشبہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنی صفات میں مخلوق سے تشبیہ دی ہے۔ اس فرقے کا بانی داؤد جواربی ہے۔

معتزلہ: معتزلہ وہ پہلا گروہ ہیں جنہوں نے عقائد کے باب میں اس چیز کے مخالف قواعد کی بنیاد رکھی، جس کو ظاہر سنت نے بیان کیا اور جس پر صحابہ ﷺ کی جماعت عمل پیرا رہی، گویا کہ معتزلہ کے تمام اصول اور ان کی تشریحات عقل وقیاس پر مبنی ہیں۔ واصل بن عطاء (۸۰ھ، ۱۳۱ھ) کو مذہب اعتزال کا بانی کہا گیا ہے، واصل بن عطا مشہور جلیل القدر تابعی حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، حسن بصری رحمہ اللہ کی مجلس میں ایک دفعہ واصل بن عطاء بول پڑا کہ مرتکب کبیرہ نہ مؤمن ہے، نہ کافر، اس طرح اس نے ایمان وکفر کے درمیان واسطہ ثابت کیا، جس پر حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "قد اعتزل عنا" کہ یہ تو ہماری جماعت سے الگ ہوگیا، معتزلہ نے خود اپنا نام اصحاب العدل والتوحید رکھا، مامون الرشید کے دور میں ان کی حکومت تھی۔

جہمیہ: یہ جہم بن صفوان ترمذی کی طرف منسوب ایک فرقہ ہے، جہم بن صفوان صفات باری تعالیٰ کی نفی اور تعطیل کا قائل تھا اور یہ عقیدہ دراصل اس نے جعد بن درہم کی تقلید کرتے ہوئے اپنایا، جہمیہ کا ایک تفرد یہ بھی ہے کہ وہ جنت اور جہنم کے فناء کے قائل ہیں اور ایمان ان کے ہاں صرف معرفت کا نام ہے۔

جبریہ: فرقہ جبریہ وہ لوگ ہیں جو افعال اختیاریہ مثلاً کفر وایمان، طاعت اور معصیت وغیرہ کے بارے میں بندہ کو مجبور محض مانتے ہیں۔ یہ فرقہ بھی جہم بن صفوان کی طرف منسوب ہے۔

قدریہ: قدریہ جبریہ کے برعکس انسان کو قادر مطلق مانتے ہیں، تقدیر اور تقدیر کا انکار کرتے ہیں، احادیث میں قدریہ کو اس امت کا مجوس کہا گیا ہے، کیونکہ مجوس دو خداؤں (یزدان اور اہرمن) کے قائل ہیں، جبکہ یہ حضرات ہر ایک کو قادر مطلق کہہ کر بے شمار خداؤں

التشریح الوافی فی حل

مختصر القدوری

مصنف

مولانا نصیب اللہ (ابن مولانا عبدالصمد [illegible])

مدرس جامعہ اسلامیہ بحر العلوم سریاب کسٹم کوئٹہ

﴿.....ناشر.....﴾

مکتبہ عمر فاروق

4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی 021-4594144-8352169

باب اور عنوان کے اعتبار سے جدید لغت

القاموس المعنون

جو تمام دفتری، اردو، صحافتی، فنی، سائنسی، سیاسی، تجارتی اور عام زندگی سے متعلق ہزاروں جدید الفاظ، محاورات، ضرب الامثال اور روزمرہ کے ضروری جملوں پر مشتمل بہترین مجموعہ

مؤلف

حضرت مولانا مفتی حضرت علی صاحب

فاضل: تخصص جامعہ فاروقیہ کراچی

تقریظ

مولانا ولی خان المظفر صاحب

استاذ حدیث جامعہ فاروقیہ

تقریظ

مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب

استاذ حدیث جامعہ فاروقیہ

مکتبہ عمر فاروقؓ

4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی